سعدیہ عزیز آفریدی

محبت جاودانی ہے

طلسمِ عشق تھا سب یہ دِل کہ موسم



سعدیہ عزیز آفریدی

محبت جاودانی ہے

"تم اس کے ساتھ اچھا نہیں کر رہی ہو۔"

"میں نے کسی سے مشورہ نہیں مانگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کیا نہیں اس لیے جو میرا دل چاہتا ہے وہ کر رہی ہوں۔" اس نے سامنے رکھے گلدستے کو کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

"آخر تمہیں اس سے پرخاش کیا ہے۔" مترنم آواز نے پھر سوال کیا۔

"بس نہیں پسند مجھے وہ بندہ' میں اسے جب دیکھتی ہوں میرا خون کھول جاتا ہے۔"

"اسے دیکھ کر تمہارا خون کھول جاتا ہے' تمہارا' علینہ ملک کا خون کھول جاتا ہے۔" آواز حیرت بن کر اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

"ہاں میرا خون کھول جاتا ہے علینہ ملک کا خون' میرا بس چلے میں اسے کسی ایسے پاتال میں گم کر دوں کہ پھر وہ چاہے بھی تو میری نظروں کے سامنے نہ آسکے۔"

"تمہیں نہیں لگتا تم آفندی کے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔"

"نہیں رافعہ درانی مجھے نہیں لگتا میں آفندی کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں میرا جو دل چاہتا ہے میں نے ابھی اس کا دس پرسنٹ بھی نہیں کیا۔"

"کیا تم چاہتی ہو آفندی مر جائے؟؟"

"نہیں مر سکتا وہ' اس جیسے مطلب پرست خود غرض ابن الوقت قسم کے لوگ نہیں مرا کرتے مرنے کے لیے' جان کی بازی لگانے کے لیے انسان کا حساس ہونا' جی دار ہونا بہت ضروری ہے۔" وہ لمحہ بھر کو چپ ہوئی اور آہستگی سے بولی۔

"یہ بتاؤ تم نے چائے منگوائی ہے یا نہیں دماغ کی ساری نسیں کھنچ گئی ہیں۔"

"ہاں منگوائی ہے چائے۔" رافعہ درانی نے دراز سے بسکٹ کا پیکٹ برآمد کیا تھا اور اسی وقت ان کا پیون چائے کے دو کپ سجائے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"علینہ باجی وہ آپ کے مہمان کمرے کے باہر کھڑے تھے میں نے کہا بھی کہ اندر آجائیں مگر انہوں نے مسکرا کر کہا نہیں مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آگیا ہے۔ ویسے جب میں گیا تھا تب تو وہ اندر کرسی پر بیٹھے تھے پھر باہر کھڑے کیا کر رہے تھے۔"

"اپنی کھو جانے والی اوقات ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" ترت جواب دے کر علینہ نے بسکٹ کا پیکٹ پھاڑا پیون چلا گیا تھا اور حسب توقع رافعہ درانی پوری حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔" وہ مزے سے چائے کے ساتھ بسکٹ کا لطف اٹھاتے ہوئے مطمئن انداز میں پوچھنے لگی اور رافعہ درانی اٹھ کر اس کے سامنے والی کرسی پر آگئی۔

"مجھے لگا تھا غلام الدین کی بات سن کر تم تھوڑا سا شرمندہ ہو گی مگر تمہارے چہرے پر تو شرمندگی کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔"

"کیوں ہو گا میرے چہرے پر شرمندگی کا نشان' میں نے کیا غلط کیا ہے۔"

"اپنے دل سے پوچھو کیا واقعی تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔" رافعہ درانی نے تیز آواز میں پوچھا مگر وہ ٹائم ضائع کیے بغیر اپنی نئی کور اسٹوری کا فائنل ٹچ دینے لگی

ناولٹ

وہ ایک این جی او کے تعاون سے ایک میگزین کی ایڈیٹران چیف تھی بظاہر یہ پرچہ باقاعدہ طور پر اس این جی او سے منسلک نہیں تھا مگر جاننے والے جانتے تھے مسز فاروقی اور مرزا جالب اس این جی او کے سرکردہ رکن ہیں مگر قانونی طور پر اس میگزین کے تمام تر اخراجات ان کے ذاتی اکاؤنٹ سے شو کیے جاتے تھے اس طرح وہ کم دکھا کر دونوں اطراف سے کماتے تھے اور ثواب دارین مفت میں ہاتھ آجاتا تھا رہی رافعہ درانی تو وہ ایک آئیڈیلیسٹ لڑکی تھی دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی تھی اور چاہتی تھی دنیا بھی اسی کی نظر سے دنیا کو دیکھے بلند خیالات محبت' حساسیت' دنیاداری میں رہتے ہوئے زندگی کو عام بھیڑ بکریوں سے افضل درجے پر جا کر جینا یہی مقصد اسے یہاں لایا تھا اور نظر بچا کر وہ کبھی کبھار اس طرح کا کوئی بلنڈر کر ہی دیا کرتی تھی رہی علینہ ملک تو رافعہ درانی کی طرح اس کی زندگی کی

کوئی خاص شغف نہیں تھی سوشیالوجی میں ایم اے کیا تھا اور اب بظاہر دنیا کو بدلنے کے سوانگ میں اپنی زندگی کو کیسے بہتر سے بہتر جیا جائے کی دوڑ میں شامل ہو گئی تھی اور یہی بات رافعہ درانی میں اور اس میں الگ تھی۔

"تم شام کو کب تک جاؤ گی۔" رافعہ درانی کو اپنی ماں کو آنکھیں ٹیسٹ کروانے کے لیے لے کر جانا تھا تبھی وہ ساڑھے چار بجے سے ہی اپنی چیزیں اپنے بڑے سے بیگ میں ٹھونس رہی تھی اور علینہ ملک لکھتے لکھتے پتا نہیں کہاں گم ہو گئی تھی۔

"تمہیں کتنی فیل ہو رہا ہے۔" وہ اپنی ہی مرضی سے بات نکال کر لائی۔

"نہیں میں تو یہ سوچ رہی ہوں اگر ایسی کور اسٹوری میں کسی غیر ملکی جریدے کو دوں تو بہت آسانی سے بہت سارا پیسہ کما سکتی ہوں۔"

"پیسہ' یہ تمہاری زندگی کا مقصد پیسہ کب سے ہو گیا تم نے تو اس میگزین میں شمولیت کچھ نیا کر جانے کچھ نئے راستے کھوجنے' کچھ نئی منزلوں کی طرف سفر کرنے کی شرط پر کی تھی۔"

"تو ہر ادارے کو دیکھتے ہوئے بندہ اپنے کمٹمنٹ پاس کرتا ہے اگر میں یہاں آنے کی وجہ یہ بتاتی مجھے کہیں اچھی جاب نہیں مل رہی تھی اس لیے آپ کا میگزین جوائن کیا' تو کیا مجھے نوکری مل جاتی؟؟"

رافعہ درانی چپ رہی تھی اور وہ پھر سے بولی تھی۔

"یہاں سب کچھ فار سیل ہے مائی ڈیئر خریدنے والے کی جیب بھاری ہو تو سب بک جاتا سب خریدا جا سکتا ہے۔"

"تم آہستہ آہستہ کتنا بدلتی جا رہی ہو چھ سال پہلے جب ہم ملے تھے تم کتنا مختلف سوچا کرتی تھیں۔"

"شاید میں اپنی جگہ بنانے کے لیے مختلف سوچنے کی اداکاری کیا کرتی تھی اور اندر سے ایک عام سی لڑکی تھی روپے پیسے نام کے پیچھے بھاگنے والی عام سی لڑکی۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا اگر میں بلیک شیپ بن کر تمہاری یہ ساری باتیں نمک مرچ لگا کر اونرز تک پہنچا دوں۔" علینہ ملک ہنس پڑی تھی۔

"مجھے تم سے ایسی کوئی توقع نہیں کیونکہ تم بے وقوفانہ حد تک دوستی' محبت پر یقین رکھتی ہو اگر بالفرض تمہیں اس شکایت کے بدلے کوئی مراعات ملیں بھی تو تم جانتی ہو ان چھ سالوں میں' میں نے اتنی جگہ بنالی ہے اس فیلڈ میں کہ میں اس سے اچھی سیلری پر کہیں بھی جا سکتی ہوں۔

تمہیں پتا ہے میرے ماموں ایک کپڑے کی دکان پر سیلزور کرتے تھے اور اپنے کام کے اتنے ماہر اپنی مرضی سے کام ہٹ کر کرنا پسند نہیں کرتے تھے نوکری منہ پر مار کر شام کے بازار میں پھر کسی نئی دوکان پر سیلز ورکنگ پر کھڑے ہوتے اور ممانی کو پتا تک نہ چلتا کہ وہ پہلی نوکری کو نیل کر چکے ہیں۔"

"تم نے کس کو کام کو کپڑے بیچنے سے ملا دیا تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"نہیں میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے بزنس مائنڈ ڈ ہوں اس لیے۔۔۔۔ ویسے کریٹوٹی ہر شعبے میں ہر شخص کر رہا ہے تم کسی موچی کی دوکان پر کھڑے ہو کر اس کے ہاتھوں کی مہارت دیکھو وہ کیسے ٹانکا لگاتا ہے کیسے مرمت کر کے بے کار چیز کو کار آمد کر دیتا ہے کریٹوٹی تو بھی ہے مگر ہم یہ صرف لکھنے پڑھنے والے لوگوں سے مشروط کر لیتے ہیں حالانکہ بہت خوب صورت لفظ لکھنے والے لوگوں کے اندر جھانک کر دیکھو تو صرف اندھے کنویں کی بازگشت کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا ان سے مل لو تو لگتا ہے لفظ صرف جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں۔"

"تم بزنس مائنڈ ہو تم نے یہ کہا تو کیا آفندی سے میل جول یہ چار سال کی رفاقت یہ بھی کسی بزنس کا حصہ تھی۔"

علینہ ملک کو چپ لگ گئی رافعہ درانی اسے دیکھتی رہی مگر اس نے سر نہیں اٹھایا تھا یہاں تک کہ رافعہ درانی آفس سے اٹھ گئی تھی تب اس نے خاموشی سے سوال کیا تھا۔

"کیا واقعی آفندی سے تم نے بزنس پوائنٹ آف ویو سے میل جول بڑھایا تھا۔" آنکھوں میں نم اتر آیا

تھا مگر اس نے یہی کہا ہوا اوں سے۔

"ہاں مجھے آفندی سے نفرت ہے میرا دل چاہتا ہے وہ مر جائے وہ ٹوٹ پھوٹ جائے بالکل ذرہ بن جائے پھر میں اسے اپنی سینڈل کی ہیل سے مسل کر مکمل طور پر ختم کر دوں۔"



وہ ریل پر وہ رسالہ ہاتھ سے رکھ کر اٹھا تھا۔

سامنے غیر متوقع طور پر آفندی کھڑا تھا مگر صبح کے آفندی اور اس وقت کے آفندی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"خیر ہے کیا ہو گیا ہے جان برادر۔"

وہ پوچھے بغیر اندر آیا تھا اور صوفے پر گر جانے والے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ خاموشی اس کے گرد ٹھنڈک کی طرح جمی ہوئی تھی اور آنکھوں کا نم بڑھا ہوا تھا۔

"بول بھی کیا ہوا تو تو اس علینہ ملک سے ملنے گیا تھا۔"

"ہاں میں گیا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ آج میں اتنے دنوں کی بے رخی کا سبب پوچھوں وہ وجہ بتائے تو میں بے وجہ اس سے لڑ مروں وہ جب مجھے منانے لگے تو میں یہ ڈبیا نکال کر اس کے سامنے رکھ دوں پھر کہوں علینہ کیا تم آفندی سے شادی کرو گی اور وہ میرے اس جملے پر جھوم اٹھے مگر۔۔۔۔"

"مگر کیا؟" اس چہرے نے فکر مند سا ہو کر پوچھا اور آفندی کی آواز بھرا گئی۔

"مگر یہ کہ اس نے کہا میرا دل چاہتا ہے تم مر جاؤ میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں کسی ایسے پاتال میں پھینک دوں کہ پھر تم چاہو بھی تو مجھے نظر نہ آسکو۔"

"وہ کون ہوتی ہے میرے یار کو موت کی سزا دینے والی اس کی تو میں۔۔۔" اس نے نازیبا کلمات کہنے چاہے مگر آفندی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیے۔

"ہم محبت کر سکتے ہیں مگر کسی کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ بھی ہم سے محبت کرے۔"

"اسی لیے مجھے محبت سے نفرت ہے سالی یہ محبت وحبت کچھ بھی نہیں ہوتی ادھر دیکھ میرا باپ اور میری ماں دونوں نے محبت کی شادی کی دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر جیتے تھے میں پاگل کا پتر اس محبت پر خوش کہ اس ارضی دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہا تھا مگر جب اماں مریں تو ابا نے کہا اوگاڈ اس محبت کے سوانگ کو کرتے کرتے میں تو پگلا گیا تھا نہ اپنی نیند سوتا تھا نہ اپنی نیند جاگتا تھا بیوی کے سامنے کتا بن گیا تھا۔" میں نے ابا کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"آپ کو محبت نہیں تھی تو جھوٹ کیوں بولتے رہے۔" تو ابا نے کہا۔

"اس سالی کے گھر میری دو بہنیں بیاہی تھیں انہیں آباد رکھنے کے لیے یہ سوانگ بھرے پھرتا تھا۔"

مجھے اس دن ابا پر پتا نہیں غصہ آیا یا ترس مگر کچھ تھا جو اندر نرم نرم ہاتھوں سے چھناکے سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ میں اس دن اماں کی قبر پر جا کر خوب رویا پھر ان کے چالیسویں کے بعد ان کی الماری کھولی تو اماں کی ڈائری ہاتھ لگ گئی۔ اس ڈائری میں ابا کو ایسے ایسے الفاظ سے نوازا گیا تھا کہ ابا پڑھ لیتے تو اماں طبعی موت نہ مرتیں ابا کے ہاتھوں قتل ہو کر مرتیں' ابا کے ساتھ وہ اس لیے رہتی تھیں کہ ان کے وڈیرے بھائی ابا سے زیادہ جنگلی اور جانور تھے ابا کا ڈھکا چھپا جنگلی گنوار پن وہ برداشت کر سکتی تھیں مگر اپنے گھر میں تیسرے درجے کا شہری بن کر رہنا نہیں چاہتی تھیں اس دن محبت کا پندار ایسے ٹوٹا کہ دل نے اس محبت نام کی کمینگی کو دو حرف کہہ لیے تو بھی بھول جا کچھ نہیں رکھا اس اضافی من موجی کرنے میں' دیکھ مست جی' مجھے دیکھ مجھے پندرہ دن میں نئی لڑکی مل جاتی ہے جیب میں دھیلہ ہو تو میلہ یوں لگتا ہے یوں۔"

"تجھے پتا ہے میں ایسا بندہ نہیں ہوں مجھے میلہ نہیں دیکھنا میں ایک گھر گرہستی والے گھر کے خواب دیکھنے والا انسان ہوں۔"

"ایک گھر کے خواب یعنی چھوٹا سا آنگن چاندنی کی کھڑکی اور دو خوب صورت خوب صورت بچے زندگی

کی تلخی میں زہر گھول دینے والے' میں جب چھوٹا تھا تو بڑا کمینہ ہوا کرتا تھا دونوں کو انگلیوں پر نچاتا لوگوں کو فرماں بردار اولاد ملتی ہے مجھے فرماں بردار ماں باپ ملے تھے۔ پھوٹی آنکھ میں یک دیدہ ہو تو بینائی کی قدر ہوتی ہے۔"

"آذر بس کر دے ماں باپ کا ذکر احترام سے کیا کر چاہے وہ کیسے بھی ہوں۔"

"ابے چل چاہے وہ کیسے بھی ہوں' میرے ابا کی طرح بھی ہوں؟" تھوڑا سا وقفہ دیا پھر غصے سے بولا۔

"مجھ سے نہیں ہوتی ابا جیسے شخص کی عزت' امی کی تو برسی فاتحہ کروا لیتا ہوں پر ابا جس دن مرے تا تو انہیں تو پلٹ کر بھی نہیں پوچھنا' پتا نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہیں پچاس برس کے ہو کر میری عمر کی اٹکھیلیاں کرتے پھرتے ہیں اتنی لڑکیوں کے فون تو مجھے نہیں آتے جتنے ان کو آتے ہیں۔"

"سنبھل جائیں گے یار کچھ وقت دے انہیں۔"

"ابے میں کیا مرا جا رہا ہوں انہیں سدھارنے کے لیے آج مرے کل وہ برا دن' جو کر رہے ہیں خود بھگتیں گے مگر مسئلہ ہے اس احمق لڑکی کا۔"

"وہ احمق نہیں ہے یار بہترین دماغ ہے' اس کے دماغ اس کے لفظوں ہی نے تو مجھے متاثر کیا تھا وہ ہمارے چینل کے لیے فری لانس ڈیسک ورک کرتی تھی "شاہ زیب" کا پروگرام "سچ" اسی کے ہوم ورک کی وجہ سے کامیاب تھا۔"

"کیا ہم اس وقت اس کی ذہانت پر ماتم کرنے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔"

"نہیں مگر کیا کریں ہر ایک کی قسمت میں محبت تو نہیں ہوتی' کاش وہ دل بھر بھر کے گالیاں دیتی اپنی ڈائری کے صفحے بھرتی رہتی مگر تیری اماں جیسی بھی محبت کرتی رہتی تو میں خود کو خوش قسمت سمجھتا۔"

"اللہ معاف کرے دنیا میں اگر میں کسی کے لیے اچھا سوچتا ہوں تو وہ تو ہے خبیث' میری دعا ہے اگر تجھے زندگی میں محبت ملے تو پوری محبت ملے سچی محبت ملے....." اس نے کھینچ کر آفندی کو گلے لگا لیا تھا مگر آفندی

رویا نہیں تھا پھر یہ تین دن کے بعد کی بات تھی اس کے فلیٹ میں علینہ ملک چلی آئی تھی وہ صم بکم ہو گیا تھا۔

"تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے۔"

"میں ایک بار پوچھنا چاہتا ہوں تمہیں مجھ سے ایک دم اتنی نفرت کیوں ہو گئی ہے۔"

"محبت کب ہوئی تھی جو تمہیں نفرت کا غم کھائے دے رہا ہے۔"

"ہم بہت اچھے دوست تھے علینہ....." وہ اس کے قدموں میں بچھ گیا تھا۔

"ہم دوست کبھی نہیں تھے آپ کی اور ہماری اوقات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"کیا تم مجھے عزت دے رہی ہو یا مجھے ذلیل کر رہی ہو۔"

"یہ آپ کی ذہانت پر منحصر ہے میں تو لفظ لکھتی ہوں لوگ انہیں اپنے من مرضی کے چولے پہناتے رہتے ہیں میں نے کبھی پروا نہیں کی دوسروں کی سوچ کے لیے میں نے خود کو کبھی دق نہیں کیا۔"

"علینہ....."

"آپ کو کب لگا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟" وہ پتا نہیں اسے کس فیز میں کھینچ لینا چاہتی تھی۔

"پہلے دن سے تمہارا جب پہلا آرٹیکل پڑھا تھا تمہارے اندر کی حساس لڑکی نے مجھے متاثر کیا تھا اس دن میں نے خود سے کہا تھا تبدیلی لانے والے دماغ تم جیسے ہوتے ہیں اتنا مختلف سوچتی تھیں تم....."

"میں اتنا مختلف اس لیے سوچ سکتی تھی کیوں کہ مجھے قدم رکھنے کے لیے جگہ اور ایک اچھا مستقل درکار تھا آپ تو جانتے ہیں آج کا دور نمائش پسندی کا دور ہے اور اسی معاشرے میں مجھے لائم لائٹ چاہیے تھا اور یہ ان لفظوں میں ہی پنہاں تھا کہ میں لوگوں کے دل کی بات ان کے دل کی زبان میں لکھتی تاکہ پڑھنے والوں کو لگتا میں بھی ان میں ہی سے ایک فرد ہوں اور مسٹر آفندی یہ ٹرک کبھی ناکام نہیں ہوتی۔"

"مگر میں نے تو یہ کبھی نہیں سوچا تھا میں تو تمہاری

طرف پوری ایمانداری سے بڑھا تھا۔"

"ایمانداری اور تمہاری ذات یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں آفندی۔"

"علینہ تم ایسا کیوں سمجھتی ہو؟"

"اچھا ایک بات بتاؤ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ کیا تمہاری ذاتی کمائی کا ہے۔"

"ہاں جو کچھ کمایا ہے میں نے اپنی محنت سے کمایا ہے۔"

"اپنی محنت سے کیا واقعی تمہیں اس کا یقین ہے؟ اچھا تمہیں کیا کبھی لگتا ہے سچ کبھی نہ کبھی اتنے بھرپور طریقے سے بولتا ہے کہ پھر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔"

"سچ کبھی اتنے کان پھاڑ دینے والے لہجے میں نہیں بولتا کہ سماعت پر گراں گزرے' سچ دل میں سرسراہٹ بن کر دوڑتا ہے اور چھا جاتا ہے۔"

"شاید پرانے کسی دور میں سچ کی یہی تعریف ہو مگر آج کے دور میں سچ وہ ہے جو میڈیا دکھاتا ہے جو اینکر پرسنز کھینچ کھانچ کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر لاتے ہیں اور میں نے یہ کر سیکھ لیے ہیں۔"

"مطلب....." وہ حیران ہوا تھا۔

"سمجھ جاؤ گے بس اتنا جان لو' لوگ جان گئے ہیں تمہارا ٹرسٹ کتنا بڑا ڈھونگ ہے اور یہ کہ تم جیسا شخص جس کے والدین کا بھی نہیں پتا اس کے اندر کتنی گراوٹ ہے دولت اور نام کے لیے کتنی ہوس ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہمیشہ اصولوں کی بات کی ہے۔"

"اصولوں کی باتیں تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتیں آفندی! رہی بات تم سے شادی کی تو ایک لڑکی شادی کرتے وقت دو چیزیں دیکھتی ہے اس کا حسب نسب اور اس کے معاشی استحکام تمہیں کیا لگتا ہے تم یہ سب کچھ مجھے دے سکتے ہو۔"

"علینہ تمہارے لیے دولت جاہ حشم کب سے اہم ہو گئے مجھے تو لگتا تھا تم انسان سے انسان کی محبت اور

بے لوث محبت پر یقین رکھتی ہو۔"

"بے لوث محبت کے زمانے گئے آفندی! اب انسان' انسان سے اسی وقت محبت کرتے ہیں جب ان کے دونوں ہاتھ بھرے ہوئے ہوں اور تم آج کے سینٹر یو میں بالکل خالی ہاتھ ہو۔"

"تمہیں واقعی مجھ سے کبھی محبت نہیں تھی۔"

"نہیں مجھے تم سے کبھی محبت نہیں رہی آفندی۔" اور آفندی کی آنکھوں کا نم اس کے خوابوں کے کناروں پر آن جما مگر وہ رویا نہیں تھا پھر کس طرح وہ اپنے فلیٹ پہنچا تھا یہ اس کو خیال بھی نہیں رہا وہ بس آیا تھا اور اپنے بیڈ پر گر گیا تھا موبائل اس کا سائلنٹ پر تھا آذر فون کر کر کے تھک گیا تھا تب وہ اس کے فلیٹ پہنچا تھا اور وہ خالی ڈھنڈار محل سرائے کی طرح پڑا ملا تھا۔

"تجھے اتنے فون کیے کیا کر رہے تھے۔" جواب ندارد اور وہ خاموش — بڑے آفندی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے پاگل اس طرح کیا ٹکر ٹکر چھت کو دیکھ رہا ہے۔" وہ اب بھی کچھ نہیں بولا تھا۔

"مجھے سمندر میں ڈبو دو جا کر میں مرجانا چاہتا ہوں۔"

"تیرا دماغ ٹھیک ہے سمندر ایسی گندی مندی جانوں کو تھوک دیتا ہے چل زیادہ ڈرامے نہ کر۔"

"آذر میں مر رہا ہوں....."

"کیا مطلب؟" آذر کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا وہ بجلی کی تیزی سے آگے آیا تھا۔

"تو نے کوئی ڈیم فل قسم کی حرکت تو نہیں کی۔"

"میں نے سلیپنگ پلز کھائی ہیں۔" وہ سوئی جاگی آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولا اور وہ چلایا۔

"تجھے میں قتل کر دوں گا اگر مرنے کی کوشش کی دیکھ میں ابھی ایمبولینس منگواتا ہوں ہسپتال دور نہیں اور سن سونے کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے معاف کر دے میں تیری کوئی بات کوئی فرمائش پوری نہیں کر سکا۔"

"چل دفع ہو زیادہ فلمی ہیرو بننے کی ضرورت نہیں

دیکھ تیری وجہ سے ہی تو زندگی میں رنگ ہیں۔" وہ ہسپتال کا نمبر ڈائل کر رہا تھا اور اسے باتوں میں لگا رہا تھا۔

مگر اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں تبھی اس نے کچن سے چھری اٹھائی تھی۔

"چل ساتھ مرتے ہیں پھر۔۔۔" اس نے چھری کو کلائی پر رکھا تھا آفندی کے وجود میں ہل چل مچی تھی۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا؟" بہت مدھم آواز میں اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تب تک وہ چھری کو کلائی پر چلا چکا تھا خون نکلا تھا اور وہ سسکاری لے کر اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

"چل اب مزے سے دونوں جہنم میں چلیں گے دونوں کے تکے کتنے مزے دار ہوں گے نا۔" آفندی اٹھ بیٹھا تھا۔

"پاگل ہے تو۔" اس کی نیند بھری آنکھیں کھل گئی تھیں اور وہ یہی چاہتا تھا کہ وہ سو نہ سکے۔ آفندی چلایا تھا۔

"فرسٹ ایڈ باکس وہاں رکھا ہے پٹی تو باندھ خون کتنی تیزی سے بہہ رہا ہے۔"

"بہنے دے تجھ سے بڑھ کر تھوڑی ہے چل اٹھ میرے ساتھ واش روم چل۔" وہ کسی نہ کسی طرح اس جیسے تن و توش والے بندے کو واش روم لے گیا تھا پھر اس کے حلق میں انگلی ڈال ڈال کر دو تین وامیٹ کروائی تھیں اس کے وجود کا سارا بوجھ اس کے اپنے وجود پر تھا اور آفندی نے منہ دھو کر اس کے کندھے سے آنکھیں رگڑی تھیں۔

"اب تو ہاتھ کی بینڈیج کر لے خون دیکھ کتنی تیزی سے بہہ رہا ہے۔"

"جب تک تو زندہ ہے میں بھی مر نہیں سکتا اور سن ہم دونوں بڑے کمینے انسان ہیں اتنی جلدی نہیں مریں گے۔" لمحہ بھر کو رکا پھر آہستگی سے بولا۔

"چل اب ہوش کر تھوڑا۔" وہ اسے تھام کر واپس کمرے میں لایا تھا۔

اے سی کی کولنگ تیز کی تھی۔

"ٹی وی والے کہتے ہیں اے سی ہمیشہ 26 پر چلائیں 26 پر۔" وہ خود ہی کہہ کر ہنسنے لگا مگر اب وہ پریشان ہو رہا تھا کیوں کہ آفندی پھر سونے کی پوزیشن اختیار کر رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے خود ہسپتال لے کر بھاگتا ایمبولینس کے رکنے کی آواز آئی آفندی کے نام کی وجہ سے پیرا میڈیکل اسٹاف اس کے فلیٹ میں ہی آ گیا تھا۔

"یہ خبر کہیں سے بھی لیک آؤٹ نہیں ہونی چاہیے۔"

"جی اسی لیے میں کوئی خاتون نرس ساتھ نہیں لایا میری آفندی سے اچھی دعا سلام ہے اس لیے آپ بے فکر رہیے۔" ڈاکٹر کہہ کر طبی امداد کنٹی نیو کرنے لگا تھا پھر دو گھنٹے بعد اس نے آخری کارروائی کی اسے انجکشن دیا۔

اور آذر تھا اس کے سو جانے پر پریشان ہو کر بولا تھا۔

"سو کیوں گیا ہے؟" ڈاکٹر نے پلز نوٹ کی تھیں پھر آہستگی سے بولا۔

"ہم نے سب بہتر طریقے سے کر لیا ہے یہ نیند کی گولیوں کا اثر ہے دو تین دن رہے گا وہ سوتے جاگتے رہیں گے مگر یہ ان کے اسٹریس سے بچنے کے لیے اچھا بھی ہے ویسے آپ بہت کمال چیز ہیں آپ نے بہت ذہانت سے ان کی توجہ ڈائیوٹ کی اگر یہ سو جاتے تو ان کو بچانا بہت مشکل کام تھا آپ کا زخم بہت ہلکا سا ہے یہ آپ نے فرینڈ کے لیے خود کو لگایا تھا۔ مجھے کہنے دیجیے اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو جتنی پلز انہوں نے لی تھیں ان کا بچایا جانا ناممکن تھا آپ نے انہیں وامیٹنگ بھی کروانے کی کوشش کی تھی یہ بھی بہتر رہا۔" وہ اب بیٹھ چکا تھا آذر ان سب کے لیے چائے اور اسنیکس رکھ رہا تھا۔

"آفندی صاحب بہت بیسٹ انسان ہیں بہت باہمت مگر جو کچھ ان کے ساتھ کیا گیا واقعی بہت اذیت انگیز ہے اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی خودکشی کرنے کو ہی ترجیح دیتا۔"

"کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے آفندی کے

ساتھ۔" آذر کو اچنبھا ہوا تھا کہ علینہ کا معاملہ کیسے لیک آؤٹ ہوا اور ڈاکٹر صاحب بولے۔

"ابھی شام کی نیوز میں چینل پر ایکس کلوز رپورٹ چلی آفندی کا بچپن جوانی سب الٹ پلٹ کر رکھ دی گئی ہیں اسے جی بھر کے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"اچھا۔۔۔" آذر کا رنگ اور پھیکا ہو گیا تھا اس کی ہائی انگلش چینل ہوا کرتے تھے یا کبھی کبھار "وی وی پورٹ" پر آفندی کی ڈاکومنٹریز پلس ٹاک شو دیکھ لیا کرتا تھا کیوں کہ ہر پروگرام کے بعد آفندی اس سے فون کر کے پوچھتا تھا وہ اس کے پروگرام میں تنقیدی پہلو سے گفتگو کرتا اور آفندی کو یہی بات پسند تھی۔

ڈاکٹر دو گھنٹے مزید رکا تھا اور آذر عباس اس کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ساری رات وہ نیند میں بڑبڑاتا رہا تھا۔

"تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں علینہ! مجھے تمہاری آنکھوں میں ہمیشہ اپنے لیے احترام اور ایک خاموش محبت کا اظہار ملا کرتا تھا۔" دوسری صبح وہ اٹھا تو ڈاکٹر اس بار تنہا آیا تھا خاموشی سے چیک اپ کر کے اس کے لیے دوائیں اور کھانے کا مینیو سیٹ کر کے چلا گیا تھا اور وہ بلیک کافی لیے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"چل کافی پی اپنی طرح کالی اور کڑوی سی۔" کافی کی اس تشبیہ پر وہ ہمیشہ اس سے لڑ پڑتا تھا مگر اس وقت وہ خاموش بیٹھا تھا۔

"چل نا میں ایویں مذاق کر رہا تھا میرا رنگ تیری طرح صاف نہیں نا اس لیے جلتا ہوں تجھ سے بقول تیرے۔" وہ اب بھی کچھ نہیں بولا تھا اس کی توجہ ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

"کیا چاہیے۔۔۔" وہ جانتا تو تھا کہ اسے کیا چاہیے مگر وہ پھر بھی اسے بولنے پہ مجبور کرنا چاہتا تھا۔

"ریموٹ کہاں ہے؟"

"یہ رہا میرے پاس کیا دیکھنا ہے۔ بین 10 یا ٹام اینڈ جیری۔" اس نے ریموٹ اس کے حوالے کیا تھا اور اس کی توقع کے مطابق وہ ایکس کلوز چینل لگا کر بیٹھ گیا تھا اس کے موضوع پر ٹاک شو ہو رہا تھا۔

"مسٹر آفندی ایک گریٹ انسان ہیں میڈیا کو اب تک ان کے ساتھ پر شرمندگی ہے کہ انہیں اس قدر تعظیم دی اس قدر۔۔" وہ ایک دم پھر سے حال سے کیموفلاج کر گیا تھا وہ وہاں تھا مگر کچھ نہیں سن رہا تھا۔

"تو ٹھیک کہتا تھا ہم میڈیا کے لوگ گدھ کی طرح ہیں خبر ملتی ہے اور وہ ٹھیک ہے بغیر لحاظ کے ملک کے فائدے میں ہے نقصان میں ہے بس سب سے پہلے چلا دیتے ہیں میں ایک بات کہتا تھا ہم میڈیا کے لوگ ہی لوگوں کو بناتے ہیں اور جب چاہیں انہیں خاک میں ملا کر خاک بھی کر دیتے ہیں اس سارے سینٹرو میں یہ سب میرے یار دوست ہیں مگر اس وقت یہ میری بدنامی کو شہرت کو بھی کیش کر لینا چاہتے ہیں ان کیمرہ ہوتا بارہواں کھلاڑی والی حسرت کی طرح ہے اور یہ سب اس حسرت اس پیاس کو منا رہے ہیں۔ انہیں لگتا ہے موقع سے فائدہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے اور وہ اٹھا رہے ہیں اور مجھے ان میں سے کسی سے شکوہ نہیں۔"

"مجھے شکوہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ میں جانتا ہوں دنیا میں اگر کوئی سچا انسان ہے کوئی اصولوں کی بات کرتا ہے تو وہ تو ہے۔"

"میں کہتا تھا میں میڈیا ہوں جسے چاہوں آسمان پر بٹھا سکتا ہوں جسے چاہوں زمین پر پٹخ سکتا ہوں مجھے اپنی ذہانت اپنی چابک دستی موقع کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی صلاحیت پر ناز تھا مگر میں غلط تھا میرا یقین جھوٹا تھا میں ایک عام انسان تھا اور اپنی سرپھری طبیعت کے ساتھ آسمان پر کیے جانے والے فیصلوں سے جھگڑ پڑا تھا۔"

"تمہیں کس بات کا دکھ ہے؟" آذر عباس نے نئے سرے سے اسے دریافت کرنے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں مجھے اپنے مرنے کا غم ہے یا اپنی غلطی کو سمجھ لینے کی خوشی یا یہ جان کر دل دکھا ہے کہ دنیا میں علینہ نام کی ایک محبت تھی جس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا نہیں آفندی مجھے تم سے محبت نہیں۔"

”اس بے وقوف لڑکی کو رہنے دو اس سے میں نبٹ لوں گا بس یہ معاملہ کیسے دبایا جائے یہ بتا؟“

”اس لڑکی سے کیسے نبٹ سکتے ہو؟“

”سیدھا سادا بندہ ہوں دوغلی بات نہیں کرتا میرا تو ایک ہی طریقہ ہے لڑکی کو تھوڑا سا دھمکانا ہے دو چار اچھی بری باتیں کرنی ہیں اسے سیدھا ہو جانا ہے۔“ آفندی قہقہہ لگا کر ہنسا مگر اس قہقہے میں خوشی نہیں دیوانہ پن جھلک رہا تھا۔

”تجھے کیا لگتا ہے وہ اتنی دبو لڑکی ہے کہ تیرے دھمکانے میں آجائے گی۔ آذر میری بدنامی کی کمپین اس کی محنت اور ہوم ورک کا نتیجہ ہے وہ پس پردہ رہ کر بڑے بڑے کام کر گزرنے والے لوگوں میں سے ہے۔“ آذر عباس حیران ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

”مگر رپورٹنگ پر تو ایکس کلوزو کے سیکنڈ کمانڈ احمد درانی کا نام چل رہا ہے۔“

”ہاں احمد درانی میری کامیابی سے ناخوش رہتے تھے مگر ان کی ادارے میں ایک نہ چلتی تھی پھر یہ ایشو ہاتھ آگیا تو ان کی تو دل کی مراد بر آئی علینہ اسٹریس لے کر کام نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے اس نے اپنی رپورٹنگ اچھی قیمت پر بیچ دی اسے نام اور شہرت سے نہیں پیسے سے سروکار ہے۔“

”علینہ اور پیسے سے سروکار وہ تو ہمیشہ اصولوں کی‘ سچائی کی‘ سچ بیانی کی بات کرتی ہے۔“ آفندی کچھ نہیں بولا تھا۔

”دیکھ ایک کام کرتے ہیں ہم ایک پریس کانفرنس بلواتے ہیں اور اس ساری اسٹوری سے لاتعلقی کا اظہار کر لیتے ہیں۔“

”اپنی سچائی سے لاتعلقی کا اظہار کرنا آسان ہے اس نے میرے چلڈرن ہوم کے ایڈمن سے ملاقات ریکارڈ کی ہے‘ میرے اس زمانے کے فرینڈز سے بات چیت کو ہائی لائٹ کیا ہے اس چلڈرن ہوم سے بھاگنے اور مستقبل بنانے کے لیے ہر صحیح غلط کو درست قرار دیے جانے پر گوشمالی کی ہے انہوں نے کہا کہ مجھ میں انسانیت نہیں ہے اپنی جان سے بڑھ کر مجھے کسی کی جان کی پروا نہیں اور اس بات کے لیے وہ جس واقعے کو بنیاد بنا رہے ہیں وہ میری چودہ برس کی عمر کے خوف کی کہانی ہے۔

اس وقت چلڈرن ہوم میں بچے کچن میں کام کر رہے تھے کہ ایک ساتھی بچے کی بے احتیاطی سے کچن میں آگ لگ گئی اس نے ڈر کے مارے جلتا ہوا کپڑا ہاتھ سے ایک جھٹکے سے دور پھینکا اور وہ گیس پائپ پر جا پڑا اس سے پہلے کہ چلڈرن ہوم کے انتظامیہ پہنچ پاتی آگ چاروں طرف بھڑک گئی سب آگ کو بجھا رہے تھے کسی حد تک آگ بجھانے میں کامیاب بھی ہو رہے تھے کہ میرا ساتھی اندر پھنس گیا مگر آگ کے بلند ہوتے شعلے میرا حوصلہ توڑ گئے اور میں نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی میری ٹانگ زخمی ہو گئی تھی مگر میرے کمرے میں رہنے والا میرا روم میٹ افضل اس آگ میں کام آگیا تھا سب کا خیال تھا کہ وہ مجھ سے چھوٹا تھا اس لیے مجھے پہلے اسے بچانا چاہیے تھا پھر اپنی زندگی کو بچانے کی تدبیر کرنی چاہیے تھی سب مجھے لعن طعن کر رہے تھے کوئی میری فیلنگ نہیں سمجھ رہا تھا کہ میں بھی تو ایک بچہ تھا چودہ سال کا سہی مگر اندر سے میں بھی ڈرا ہوا خوف زدہ بچہ ہی تو تھا مگر ان سب نے مجھے خود غرض‘ بے حس مشہور کر دیا یہی وجہ تھی کہ میں نے سر کی چھت کو خیرباد کہا اور اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے معاشرے کے اکھاڑے میں اتر گیا۔“

”مجھے معلوم ہے دنیا کتنی مشکل جگہ ہے اگر سر پر ماں باپ کا سایہ نہ ہو۔“ لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔

”میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں مگر ابا کے نام نہاد سائے میں چھپنے کو فوقیت دیتا ہوں مجھے لگتا ہے جب تک ابا میرے ساتھ ہیں میں دنیا کی سفاکی‘ دنیا کے غرور کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔“

”دنیا کا غرور ہاں تو ٹھیک کہتا ہے ہم جو سمجھتے ہیں ہماری ذات ہر چیز سے بالا‘ ہر انسان سے افضل ہے ہم جو سوچتے ہیں ہمارا دماغ ساری دنیا میں ذہانت کی ساری سیڑھیاں ایک ساتھ طے کر سکتا ہے تو درحقیقت ہماری ذات کا غرور دنیا کے غرور کے آگے مٹی چاٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ رب سچ کہتا ہے غرور انسان کو نہیں سجتا انسان کو ہضم نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں میری طرح منہ کے بل ضرور گر کر رہتا ہے۔“

”تو دل تھوڑا نہ کر اور اس کیس کو ایک ماہر الکٹیو کی طرح ہینڈل کر میڈیا کو میرے سر پر چھوڑ دے کوئی سوال پوچھنے نہیں آئے گا یہ میری گارنٹی ہے۔“ اس نے پی ٹی سی ایل فون کو مشین پر منتقل کر دیا تھا اور موبائل کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔

”تو نے مجھے کیوں بچایا آذر عباس۔“ وہ تھک کر لیٹ گیا تھا اور وہ اس کو دوا دیتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”سیدھی سی بات ہے جہاں میں ہوں وہاں تجھے ہونا چاہیے‘ جب مریں گے دونوں ساتھ مریں گے پندرہ سال پرانا عہد و پیماں ہے‘ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بس ہونا چھوڑ دنیا کو ایک بیٹ شو سمجھ یہاں جب کس کا داؤ لگ جائے وہ مور کا پر لگا کر ایلیٹ کلاس کا حصہ بن جاتا ہے بس اپنا مورال مت گرنے دے دنیا کا تو کام ہی ایک ایک قدم پر ذلیل کرنا ہوتا ہے اور اس دنیا میں جینا ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذلیل کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔“ اس کے حادثے کے ساتویں دن وہ اپنا اسے سمجھا رہا تھا۔

پھر ایک دم سے پتا نہیں کیا سوجھی وہ اس کے لیے فروٹ خریدنے کے لیے باہر جانے لگا۔

”دیکھ اب کوئی حماقت مت کرنا۔“ اس نے تنبیہہ کی۔

”مرنے کی کوشش وہ کرتا ہے جو زندہ ہو۔“ وہ بے دلی سے بولا تھا۔

”کیا جرائی باؤنسر مارا ہے چل — مجھے تو اسی حالت میں قبول ہے۔“ وہ باہر نکلا اور علینہ کی سنڈے شام کو برباد کرنے پہنچ گیا۔

”کچھ لوگ صرف بھوک ہونے پر کھاتے ہیں اور کچھ لوگ عادتاً کھاتے ہیں اور کچھ لوگ آپ کی طرح دوسروں کی زندگیاں تک نگل جاتے ہیں مگر ان کے اندر کی بھوک نہیں مٹتی۔“ علینہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں تھی۔

”آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں۔۔۔“ وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی تب اس نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

”تمہاری جی داری اور راتوں رات شہرت کی ہوس نے ایک شخص کو موت کے کنارے پہنچا دیا ہے کیا تمہیں اس کا کچھ احساس ہے۔“

”آفندی جیسے لوگ نہیں مرا کرتے۔“ سرسراہٹ بھرا بے حس لہجہ۔

آذر عباس کی جان جل گئی تھی۔

”کیا بگاڑا ہے تمہارا اس نے کہ تم اس کی زندگی کے درپے ہو گئی ہو۔“

”غیر ضروری باتوں کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتی۔“

”جب تم کسی کو غیر ضروری طور پر ڈس ہارٹ کر سکتی ہو تو تمہیں یہ بھی بتانا پڑے گا کہ آفندی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“

”آفندی ایک کرپٹ انسان ہے اور میں چاہتی ہوں دنیا سے ہر کرپٹ آدمی ختم کر دیا جائے۔“

”اس آدمی کو مار کر صرف کرپٹ آدمی مر سکتا ہے کرپشن نہیں مر سکتی اس کی جگہ کوئی اور لے لے گا۔“ وہ اس سے بحث کرنے لگا تھا۔

”تو میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کرپشن کا مقابلہ کرتی رہوں گی۔“

”کرپشن کا مقابلہ اور تم کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا نام شہرت بھی سب مانگے کی عزت کی طرح ہے تم نے بھی دولت کمانے کے لیے ہر طرح کے راستے کو اپنایا۔“

”مجھے صرف مضبوط بیک گراؤنڈ چاہیے تھا۔“ اس بار اس کی آواز مدھم تھی اور آذر عباس اس سے لڑ پڑا تھا۔

”قانون ہو تو سب کے لیے برابر ہو گا نا تم خود کو کیا مقدس گائے سمجھتی ہو کہ تم سے بازپرس نہیں کی جائے گی اگر میں تھوڑا سا ہوم ورک کر لوں نا تو تمہیں آفندی سے بڑا کرپٹ کریکٹر ثابت کر سکتا ہوں یہاں پیسے دو تو گواہیاں خرید لینا مشکل تو نہیں۔“

"یہ باتیں تمہیں مجھ سے نہیں ایکس کلوزو چینل کے اونر سے کرنی چاہئیں تاکہ تمہیں اس کام سے فائدہ بھی ہو تم جو ایک بے وقوف باپ کی اولاد ہو میں تم سے کسی عقلمندی کی توقع نہیں کر سکتی۔"

"میرا باپ بے وقوف نہیں۔" وہ آفندی کو بھول کر اپنے باپ کا دفاع کرنے لگا تھا اور وہ طنز سے ہنس پڑی پھر نرمی سے بولی تھی۔

"تمہارا باپ جس طرح کا رنگین مزاج کردار ہے وہ ایلیٹ کلاس میں ہو کر بھی چٹکیوں میں مسلا جا سکتا ہے میں اگر اس کی دو چار رنگین داستانوں کی اسنیپس یوٹیوب پر ڈال دوں نا تو تم کہیں کے نہیں رہو گے مجھے تمہیں ایکس پوز کرنے کے لیے الگ سے محنت نہیں کرنی پڑے گی تمہارے لیے عباس رضوی کا بیٹا ہونا اور آفندی کا دوست ہونا ہی سب سے بڑی گالی بن سکتی ہے اور پھر تم خود کون سے ولی ہو تمہاری کہانیاں بھی کم تو نہیں۔" آذر گھبرا رہ گیا تھا اس سے ہلا بھی نہیں گیا تھا وہ جو کہہ رہی تھی غلط نہیں کہہ رہی تھی اور ایسے دشمن جو ویسے مزاج کے ہوں وہ جب ... کشن لیتے ہیں تو اردگرد کی دھرتی کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

آذر عباس نے آفندی کے ... شاپنگ کی تھی اور گھر آ گیا تھا۔ وہ چیزوں کو فریج میں رکھ رہا تھا جب اچانک آفندی نے کہا تھا۔

"بہت سخت زبان استعمال کی ہے اس نے ..."

آذر نے مڑ کے دیکھا وہ بیڈ پر تکیہ کمر کے نیچے رکھ کر اونچا ہو کر لیٹا ہوا تھا پہلے اس کی آنکھیں بند تھیں مگر اب یہ دو کھوجتی آنکھیں اس پر جم سی گئی تھیں۔

"کس کی بات کر رہے ہو میں تو سنڈے بازار گیا تھا؟"

"اچھا مجھے لگا تم علینہ سے مل کر آ رہے ہو۔"

"اپنے یہ میڈیائی ٹوٹکے مجھ پر مت آزما تو جانتا ہے میں بڑا کمینہ انسان ہوں گھبراتا نہیں ہوں۔"

"مگر جب علینہ کے سامنے کھڑے تھے تو تمہاری بولتی پر صدمہ کیوں آ گیا تھا۔" آذر عباس کے کان کھڑے ہوئے تھے وہ تیزی سے اس کے بیڈ کے قریب آیا تھا اور منٹوں میں بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا اس نے ریسیو کالز میں دیکھا علینہ کا نمبر مسکرا رہا تھا وہ بیگ میں جو کچھ ڈھونڈ رہی تھی وہ یہی کارروائی تھی وہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ تیز لڑکی تھی۔

"وہ مجھے ختم کرنا چاہتی ہے مگر یہ صرف ہائی لائٹ ہونے کی خواہش نہیں لگتی۔"

"تجھے کیسے پتا...." آذر بیٹھ گیا تھا۔

"تیری طرح ایک دوست بے حساب وہ کہہ رہا تھا کہ احمد درانی نے بہت ہائی فائی ٹرمز اینڈ کنڈیشن پر اسے رکھنے کی کوشش کی ہے مگر اس نے صاف انکار کر دیا وہ میری سیٹ نہیں چھیننا چاہتی مگر کیوں؟"

"کیونکہ اس نے ایک جھٹکے میں تری پیٹا پلٹ دی ہے کیا اب تو اس جاب پر واپس جانے گا۔ وہ کیوں اپنا وقت ضائع کرے جب کہ سارے ... ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنے کے لیے بری ذات کے پیچھے خود ادھیڑنے کو تیار ہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر بولا۔

"تا حکم ثانی تیرے سارے بینک اکاؤنٹ فریز کر دیے گئے ہیں۔" یہ بات اس تک نہیں پہنچی تھی وہ اچھل کر بیٹھ گیا تھا پینڈا کا خمار ایک دم ... گیا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے اس طرح ٹرسٹ سے ... انتظام چلڈرن ہومز اور اولڈ ہومز کے معاملات کیسے چلیں گے کچن کا سارا انتظام ٹھپ ہو جائے گا ان بڑھوں کی دواؤں کے اخراجات کا کیا ہو گا علینہ پاگل لڑکی ہے اس نے یہ سب کچھ کیوں نہیں سوچا۔" وہ اٹھا تھا لہرایا تھا مگر آذر کے روکنے پر بھی نہیں رکا تھا۔

گاڑی کی چابی لے کر وہ نکل کھڑا ہوا تو پھر علینہ سے مذاکرات کرنے وہ اسے فالو کرتا ہوا اس کے فلیٹ کے باہر پہنچا تھا آج تک ہوٹلز "افسوس میری وہ ملتے رہے تھے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے فلیٹ تک پہنچا تھا پہلے اس کا خیال تھا وہ علینہ سے ملے اور معاملات سدھارے گا مگر اب اس نے ارادہ بدل دیا تھا وہ اب علینہ کے بھائی سے مل کر انہیں قائل کرنا چاہتا تھا

یہی سوچ کر وہ پلٹ گیا تھا پھر دوسرے دن جب وہ فلیٹ پہنچا تو دستک پر ایک بوڑھی ملازمہ نے دروازہ کھولا تھا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں علینہ بی بی گھر میں نہیں ہیں۔" ملازمہ کی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی اور وہ مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"مجھے علینہ بی بی سے نہیں ان کے بھائی عالیان ہاشمی سے ملنا ہے۔"

"وہ کسی سے نہیں ملتے آپ صرف علینہ بی بی سے بات کریں۔" ملازمہ نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر اس نے یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی تھی وہ اندر آ گیا تھا ملازمہ فون کی طرف دوڑی تھی مگر اس نے پی ٹی سی ایل کا تار نکال دیا تھا ملازمہ کو صوفے پر زبردستی بیٹھ جانے کو کہا تھا اور خود نرمی سے عالیان ہاشمی کو آواز دی تھی۔ چھٹی ساتویں آواز پر کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کون ہے کیوں آواز دے رہے تھے کیا پھر کوئی نئی خبر ملی ہے میرے بارے میں۔" آفندی کو آواز سن کر شبہ ہوا تھا پھر وہ مڑا تھا اور پتھر کا بت بن گیا تھا۔

"عالیان ہاشمی! نہیں یہ عالیان ہاشمی۔" اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو؟ کیا تم میرا انٹرویو کرنے آئے ہو۔" آفندی کا گلا خشک ہو گیا تھا اس سے وہاں رکا ہی نہیں گیا اور وہ ملازمہ سے معذرت کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور پھر فلیٹ آیا تو اس کے آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

"میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا آفندی لیکن میں آپ کی بربادی کی دعا نہیں کروں گا بلکہ میں اپنے اللہ سے کہوں گا کہ تمہیں قدم قدم پر کامیابیاں ملیں اتنی زیادہ کہ تمہیں اپنے ماضی کی یہ غلطی کبھی یاد نہ آئے تمہیں کبھی معافی مانگنے کی توفیق نہ ملے۔"

آفندی پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

"وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور مجھے یقین ہے یہ اتنی چھوٹی سی غلطی کبھی میرا راستہ نہیں روکے گی عالیان صاحب، رہیں مراعات تو میں آپ کو کسی اور چینل میں یہ سب کچھ دلوا سکتا ہوں۔" اس کا غرور بول رہا تھا۔

"نہیں میں نے کامیابی کبھی بھیک میں نہیں حاصل کی مجھے اپنے راستے خود بنانے کی عادت ہے مگر یاد رکھو جہاں میں کھڑا ہوں کسی اور وقت کسی اور سینیریو میں تم کھڑے ہو سکتے ہو اور ضروری نہیں تمہارے سامنے کوئی دل جو لیجہ تمہاری ساری ناکامی خود میں جذب کرنے کے لیے تیار کھڑا ہو گا۔" آفندی نے یکدم خود کو بستر پر گرا لیا تھا اور ماضی کا ایک ایک لمحہ اس سے ملنے چلا آیا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب اس کے دل میں سچائی کی قدر اور رشتوں کا پاس موجود تھا وہ ایک عام سا صحافی تھا جب ٹھٹھرتی سردی میں اس کے مالک مکان نے اس کا آرٹیکل پڑھ کر اپنے گھر سے باہر نکال دیا تھا وہ ایک چائے کے ہوٹل پر بیٹھا تھا جب اسے پہلی بار آذر ملا تھا وہ اس کے روز چھپنے والے آرٹیکل کی وجہ سے پہچان گیا تھا۔

"اوئے اس خبیث کی یہ مجال کہ اپنے ہیرو کو یوں ٹھنڈ لگائے۔" آفندی کا دل پتا نہیں اس کی باتوں سے کیسا پگھلا تھا کہ اس شہر میں ملنے والے پہلے ساتھ کو وہ دل کا حال کہہ سنانے سے روک نہیں سکا اور پھر اس کا رد عمل۔

"تو میری حمایت کر رہا ہے یا مجھے ذلیل کر رہا ہے۔" ٹھنڈ لگانے پر وہ جلبلایا تھا اور آذر عباس قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے تیری قسم ہم صرف تیرے حمایتی رہیں گے۔"

"تو ہمیشہ اتنا جھوٹ بولتا ہے یا صرف آج موڈ میں ہے۔" آذر عباس کی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھر سے پھیل گئی تھی۔

"جھوٹ سچ کا نہیں پتا ہم تو بس یاروں کے یار ہیں ترے قلم میں وہ بات ہے ضرور کہ روز کے روز بدن میں کچھ کر گزرنے کی امید سر اٹھاتی ہے اور میں روز سوچتا تھا تجھ سے ملنا ضرور ہے اب دیکھ نیت نیک تھی

دکھ صرف وہ ہی جان سکتا ہے۔"

"جی عالیان بھائی۔" اس نے ریشہ خطمی انداز میں کہا تھا۔ اور عالیان ہاشمی کے کاز کے لیے اتنا اہم ہو گیا تھا کہ عالیان اس پر بہت بھروسہ کرنے لگے تھے۔ بنا پڑھے دستخط کرنے لگے تھے۔ تب ہی اس نے دو، تین پراپرٹیز کے کاغذات پر سائن لیے تھے۔ انہوں نے بے گھر افراد کی کفالت کرنے کے لیے "آشیانہ ہومز" اسکیم پر عملدر آمد کیا تھا۔ لوگ روز ایک روپیہ ان کے کاز کے لیے دیتے تھے۔ اسپتال کا ایک پروجیکٹ کمپلیٹ ہو چکا تھا، دوسرے کا 75 فیصد کام ہو چکا تھا اور یہ ہی وقت تھا جب اس نے عالیان ہاشمی کا میڈیا ٹرائل فیک نام سے ایکس کلوزو کو سمیٹ کیا گیا تھا۔

پہلی قسط ہی دھماکے دار تھی۔ میڈیا ہل کر رہ گیا تھا اور عوام ہکا بکا، وہ عالیان ہاشمی کے کردار کے بخیے ادھیڑ رہا تھا۔ کیسے ایک عام پروفیسر کا بیٹا اتنے بڑے مقام پر پہنچ گیا۔ میڈیا نے عالیان ہاشمی کا گھیراؤ کر لیا تھا۔

"آپ کے اتنے سارے بینک اکاؤنٹ، اتنا پیسہ آپ کے پاس کہاں سے آیا، کیا آپ نے عوام کو چیٹ کیا ہے۔"

"نہیں میں اپنے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا، جس جرم کی سزا کبھی معاف نہیں ہوتی وہ اپنی قوم سے غداری ہے، میں غدار نہیں ہوں۔"

"پھر یہ وے آف لائف کیا آپ کے آباؤ اجداد کے زمانے سے آپ کے ساتھ ہے، یہ گھر، یہ گاڑی، یہ سب۔"

"میں سول انجینئر ہوں۔"

"تو کیا سول انجینئرنگ میں اتنی جلدی پیسہ ارن ہوتا ہے۔" ایک اور تیکھا سوال۔

"نہیں مجھے نہیں پتا، یہ اکاؤنٹ کب اور کیسے کھلے اتنی پراپرٹی میرے نام سے کس نے خریدی۔"

"تو کیا آپ اینجلز کے زمانے میں جی رہے ہیں سر۔"

"کیا ان ڈاکومنٹ پر دستخط آپ کے نہیں۔"

اخبارات میں ڈاکومنٹ چھاپ دیے گئے تھے۔

حکومتی حلقوں میں خبروں سے چٹخارے کشید کیے جا رہے تھے۔ فیر جسٹس کی باتیں ہو رہی تھیں، کمیشن بٹھایا جا رہا تھا، ملکی پیمانے پر یہ بہت بڑا گھپلا سامنے آیا تھا، سب اپنے اپنے مزے لے رہے تھے بس عوام ہکا بکا کھڑی تھی۔ عالیان شاہ کے سارے خدمت خلق کے ادارے حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیے تھے ان آشیانوں میں رہنے والوں کی آہ بکا الگ تھی۔ مگر آفندی ان دنوں ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اسے اتنے بڑے ایکس کلوزو رپورٹ پر سال کی بہترین رپورٹنگ کا ایوارڈ دیا گیا تھا، اس کا بینک بیلنس ایک دم بہت سارے ہندسوں کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ آذر عباس نے حقیقت جاننے کی کوشش کی، مگر وہ خود کو صاف نتھار کر لے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا آذر عباس کتنا جذباتی ہے اگر اسے بھنک بھی پڑ جاتی کہ عالیان والے قصے میں اس نے کوئی گیم کھیلی ہے تو وہ اس پر دو حرف کہہ کر اس سے الگ ہو جاتا اور اتنی ساری دنیا میں اس نے بہت مشکل سے ایک دوست پایا تھا۔ مطلب پرست خود غرض بہت سے رشتوں میں سے ایک سچا رشتہ جسے وہ گنوانے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ مگر ایک دوستی اس نے عالیان ہاشمی سے بھی توڑی تھی۔ وہ خود کتنا سچا اور کھرا دوست بن پایا ان کا؟

انسان کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ دنیا کو وہ ہی کچھ دیتا ہے تو کیا اس کے اندر مطلب پرستی، ذات کے زور، خود غرضی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کیا علینہ سے محبت کرنے میں بھی اس کا کوئی سواد تھا؟

"کیا وہ علینہ سے بے غرض محبت کرتا تھا۔" اس نے خود سے سوال کیا، مگر اس کے وجود کے اندر اتنے پنڈورا باکسز کھل گئے تھے کہ وہ خود کو کوئی جواب نہیں دے پا رہا تھا۔

"انسان ایک بار جیتا ہے، ایک بار مرتا ہے" اور وہ اپنی غرض، اپنے دھوکے کے ساتھ ہر روز تھوڑا مرتا تھا۔ وہ سچ بیچ کر جھوٹ بیچتا تھا، وہ کتنا گھٹیا سوداگر تھا۔

آخرت کو دنیا کی قیمت پر فارسیل کرتا آیا تھا، اب تک اسے اپنے چلڈرن ہوم کا وہ چھ سال کا بچہ نہیں بھولا تھا جو اس پر یقین رکھتا تھا۔

"آپ مجھے بچالیں گے نا آفندی بھائی۔"

"ہاں میں تمہیں ضرور بچالوں گا۔" اس نے سوچا تھا وہ اس کارنامے کے بعد ایک دم سے چلڈرن ہوم کے بچوں میں ہیرو بن جائے گا، مگر آگ کی کسی سے دوستی نہیں ہوتی۔ دہکتے شعلے برساتی آگ دیکھ کر اپنے اردگرد اسے اپنا وعدہ یاد رہا، نہ ہیرو بننے کا خواب اس نے کھڑکی کھلی تھی اور کود گیا تھا۔

"مجھے نہیں بچایا آفندی بھائی۔" کتنی راتوں تک یہ آوازیں اس کے وجود کو چھیدتی رہیں، پھر اسے عادت ہو گئی وہ چلڈرن ہوم کے مخالفانہ ماحول سے بھاگ گیا، پھر اس نے جتنا بھی سفر کیا، جو بھی ایکٹ کیا صرف اپنی ذات کی نمائش، اپنے آپ کو سب سے افضل ثابت کرنے کے لیے کیا وہ شدید احساس کمتری کا شکار تھا اور خود کو ایک ہیرو کی طرح ٹریٹ کرتا تھا جس نے نامساعد حالات میں کبھی ہار نہیں مانی۔

"مگر کیا واقعی اس نے کبھی ہار نہیں مانی تھی؟"

ہزار ہا کی طرح یہ سوال اسے پھر سے ہراساں کر رہا تھا مگر وہ تو ہاری ہوئی نسل کا نمائندہ تھا، وہ نسل جو ہر دور میں اس ملک کی جی دار قوم کے متوازی چلتی آ رہی ہے جو کہتی ہے زندگی میں کوئی ہوپ، کوئی امید بھی نہیں۔ اور وہ خود کو بزعم خود اس امید کو ڈھونڈ نکالنے والا ادنیٰ سا کارکن سمجھتا تھا۔

مگر چاہتا تھا کہ لوگ اس کی کسر نفسی پر خود سے اس پر ستائش کے ڈونگرے برسائیں اسے کندھوں پر بٹھا کر سب سے اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیں، مگر اس نے یہ سب پانے کے لیے کتنے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا۔ عالیان ہاشمی نئے سرے سے اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

ان کا کہا ہوا جملہ اس کے وجود میں سرسراہٹ پیدا کر رہا تھا۔

"جہاں میں آج کھڑا ہوں یقیناً لوگوں کے لعن طعن کو سہہ رہا ہوں، مگر میرا ضمیر مطمئن ہے مجھے پتا ہے میں نے غلط نہیں کیا، لیکن کیا آج کے بعد تم بغیر سلیپنگ پلز کے سو سکو گے، ایسی کامیابی جو بغیر محنت کے تمہیں ملے تمہارے دل کو خوشی نہیں دے سکے گی، تمہیں جب جب خود پر غرور ہو گا تب تب تمہارے اندر کا آفندی تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے گا۔ چھینی ہوئی یا لوٹی ہوئی کامیابی سے تم اپنی ذات کو کبھی ڈیفائنڈ نہیں کر سکو گے۔ زندگی چکر کی طرح ہے آج میں اوپر سے نیچے کھڑا ہوں، لیکن تم جب اوپر سے نیچے آؤ گے تو کیا کھڑے رہ سکو گے۔" وہ چلتے چلتے بیٹھ گیا تھا، اس کا سارا وجود پسینے سے بھر گیا تھا۔

تب ہی بیل بجی تھی اس نے دروازہ کھولا اور اس کے سامنے علینہ کھڑی تھی، اس نے دھکے دے دے کر اسے دیوار سے لگا دیا تھا اور پھر چلائی تھی۔

"تم اتنے گھٹیا انسان ہو سکتے ہو میں نہیں جانتی تھی، مجھ پر بس نہیں چلا تو میرا بھایان جی کو کڈنیپ کر لیا، میں تمہیں میڈیا کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی، تم سمجھتے کیا ہو خود کو اب کوئی حیثیت نہیں ہے تمہاری، تم ایک ذرہ ہو ذرہ جسے میں اپنی سینڈل کے نیچے جب چاہوں مسل سکتی ہوں۔"

آفندی جو دماغی طور پر پہلے ہی اکھاڑ پچھاڑ کا شکار تھا اس نئی آفت سے ششدر رہ گیا تھا۔

"بکو، کہاں ہیں میرے بھایان۔ آفندی میں اتنی پاگل ہو رہی ہوں کہ اس وقت تمہیں قتل بھی کر سکتی ہوں۔"

"کر دو قتل، میں مر جانا چاہتا ہوں۔" اس کی ذہنی رو یک دم معذرت کی طرف گھوم گئی تھی۔ اس نے اس کے قدموں میں بیٹھ کر بے قراری سے کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو میں واقعی بہت برا انسان ہوں، مجھ سے تم محبت تو کیا نفرت بھی مت کرنا، میں راندہ درگاہ ہوں، مجھے تم جتنا ذلیل کرو گی میرے دل سے تمہارے لیے اتنی ہی دعائیں نکلیں گی، عالیان بھائی کی بہن ہو معاف کرنے کو کہو تو بھی معاف مت کرنا، میں اتنی بے کار زندگی کے لیے کتنے انمول لوگوں سے جھگڑتا رہا۔" وہ کہہ کر سمندر کی طرح چپ ہو گیا تھا، اس کی آنکھیں غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ علینہ

ہکا بکا اس کے ردعمل کو دیکھتی رہی' وہ ابھی تک اسی طرح زمین پر بیٹھا تھا۔

"آفندی۔" اس نے اس کا کندھا ہلایا' مگر اس میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ وہ تیزی سے بیڈ پر پڑے آفندی کے موبائل کو اٹھا چکی تھی' پھر آذر کا نمبر ڈائل کیا تھا' اس نے بہت چہکتی آواز کے ساتھ اس کا فون ریسیو کیا تھا اور نان اسٹاپ بولنے لگا تھا۔

"یار یہ عالیان بھائی بڑے مزے کے انسان ہیں ان کی میموری ابھی تک اسی طرح فل ہے' مطالعہ اور زندگی کے تجربوں سے بھرپور بس تھوڑے سے ایب نارمل ہوگئے ہیں۔ مگر انسانوں کے درمیان رکھا جائے تو وہ بہت جلد کور کرسکتے ہیں' میری تو ان سے پکی والی دوستی ہوگئی ہے۔ یہ علینہ بھی نا کھا مڑ ہے' اس نے ان کو دکھ اور غم کے ساتھ خود سے لڑنے نہیں دیا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا وہ چیخ چلاتے' مگر آخرکار زندگی کو نئے پیٹرن کے ساتھ مان لیتے' پھر آہستہ آہستہ اس بات کو لوگ بھول جاتے وہ بھی اپنی ذات کی تسکین کے لیے خدمت کرنے کا کوئی اور راستہ چن لیتے' مگر علینہ اس نے ماؤں والی دل گیری سے انہیں اپنے پروں میں چھپالیا' دنیا سے کاٹ کر ایک فلیٹ میں محدود کردیا اسے لگتا تھا کہ ساری دنیا صرف ان کے کریشن کے قصے ہی ان سے ڈسکس کرے گی۔ میڈیا کے ساتھ یہ سلوک روا رکھتی تو اچھا تھا۔ مگر اس نے گناہ کی طرح انہیں گھر میں چھپا کر رکھ دیا۔ اتنا کیرنگ بندہ دن میں ہزاروں لوگوں سے ملنے والا ان کے دکھ درد سننے والا بندہ ایک فلیٹ میں محدود کردیا جائے تو ردعمل تو نکلے گا نا۔"

لمحہ بھر کو چپ ہوا' پھر آہستگی سے بولا۔

"یہ تو اتنا چپ کیوں ہے' کہیں علینہ بی بی نے تیرے بخیے تو نہیں ادھیڑ کر رکھ دیے۔" اس نے فون رکھ دیا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی' آفندی ابھی تک ایسے ہی بیٹھا تھا۔ اس بار اس نے آذر کو اپنے نمبر سے فون کیا تھا۔

"پلیز جلدی یہاں آؤ' آفندی عجیب سا بی ہیو کر رہا ہے۔" آذر نے فون سنتے ہی فلیٹ کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

عالیان بھائی کی شکل دیکھ کر وہ ان سے لپٹ گئی تھی اور پھر سے ہچکیوں' سسکیوں سے رو پڑی تھی۔ آفندی غلط تھا تو اس نے کون سے ٹھیک راستے سے کامیابی کمائی تھی اس نے تو ان لوگوں سے بھی داؤ گھات کیا تھا جو صرف اس کے قلم کی سچائی پر ایمان رکھتے تھے۔ ایک کرپٹ انسان دوسرے کرپٹ انسان کو گالی نہیں دے سکتا تھا۔ عالیان بھائی نے دیکھا' آفندی لٹے ہوئے مسافر کی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قریب آگئے تھے۔ آذر اسے آوازیں دے دے کر تھک چکا تھا۔ مگر وہ جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔

"تمہیں بھی کسی نے دھوکہ دیا ہے' کسی دوست نے؟ تمہیں پتا ہے دوست جب دھوکہ دے تو بڑا دل جلتا ہے جولیس سیزر کے آنسو ابھی تک میرے اندر گرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر شام میرے قریب آکر بیٹھ جاتا ہے' کہتا ہے کسی کا بھی اعتبار کرلو' مگر دوستی کا اعتبار مت کرنا۔" آذر نے چونک کر دیکھا' آفندی کی وجود میں تحریک پیدا ہوئی تھی۔ اس کی پتلی کا زاویہ عالیان ہاشمی پر آکر رک گیا تھا اور عالیان ہاشمی نے پھر سے کہا تھا۔

"مگر یہ آذر عباس ہے یہ کہتا ہے دنیا میں سب لوگ برے نہیں ہوتے' دنیا میں بہت اچھے دوست بھی ہوتے ہیں' یہ بھی بہت اچھا دوست ہے' یہ کہتا ہے یہ مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔

سنو تم بھی اس سے دوستی کرلو' یہ تمہیں بھی دھوکہ نہیں دے گا۔ پر وہ علینہ کہتی تھی سب لوگ برے ہیں' مگر دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں' تب ہی تو دنیا ابھی تک چل رہی ہے' تم میرے دوست بنو گے۔" آفندی نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنا سر ان کے ہاتھ پر جھکا دیا تھا۔ پھر وہ ایسے رویا تھا جیسے کسی کا ماتم کر رہا ہو۔

"میں اچھا نہیں ہوں' میں بہت برا ہوں' مگر آپ مجھے اچھا بنا سکتے ہیں' دنیا میں سب لوگ فرشتے نہیں ہوتے' مجھ جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں' عالیان بھائی مجھے معاف کردیں' پلیز مجھے معاف کردیں۔"

"تم مجھے جانتے ہو ارے واہ۔" عالیان ہاشمی بے طرح خوش ہوئے تھے۔ پھر علینہ کی طرف دیکھ کر بولے تھے۔

"یہ بہت اچھا لڑکا ہے شاید غلط فہمی کا شکار ہے کہ یہ برا انسان ہے' بابا کہتے تھے برے انسانوں کی آنکھ میں آنسو نہیں آتے آنسو صرف ان کی آنکھوں میں آتے ہیں جن کے دل نرم ہوں جنہیں اللہ توبہ کی توفیق دینا چاہتا ہو اور جسے توبہ کی توفیق مل جائے' وہ اتنی بے چارگی سے نہیں روتا' غلطی مان لینا آدھی معافی ہے۔"

"عالیان بھائی۔" آفندی نے دیکھا' وہ ایک لمحے میں دانا لگتے تھے' ایک لمحے میں معصوم سے بچے جس کا من اندر سے صاف تھا علینہ' عالیان بھائی کو لے کر اٹھی تھی۔ آذر ان کے ساتھ باہر نکلا تھا' پھر نرمی سے بولا۔

"بہنا میں نے اپنے ایک بہت اچھے ڈاکٹر دوست سے بات کی ہے' وہ کہتا ہے عالیان بھائی بالکل ٹھیک ہوسکتے ہیں' بس دو' تین ماہ ان کے ساتھ محنت کرنی ہے بی۔"

"میں ساری زندگی ان کے نام لگا چکی ہوں' دو' تین ماہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔"

"تمہاری یہ ہمت اور حوصلہ قابل دید سہی' مگر زندگی کے حصے میں سے آفندی کو کبھی باہر مت نکالنا' وہ بہت معصوم' بہت سیدھا انسان ہے' تم جانتی ہو ماں یا صرف باپ کے زیر نگرانی بچوں میں بھی کردار کی ٹیڑھ کمزوریاں رہ جاتی ہیں' وہ تو پھر ایک چلڈرن ہوم میں پلا ہوا انسان ہے اسے معافی کا مارجن تو ملنا چاہیے نا۔" علینہ کچھ نہیں بولی تھی' مگر اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ جو آذر سے ڈاکٹر کی میٹنگ کے بعد عندیہ سے پیدا ہوئی تھی' بہت گہری تھی' آذر اندر پلٹا تھا اور آفندی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا' پھر لجاجت سے بولا تھا۔

"میں برا انسان سہی' مگر اتنا برا نہیں کہ آج عالیان بھائی کو اس حال میں دیکھ کر بھی سچ نہ بولوں' آذر یہ سب میری وجہ سے..." آذر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں اس کہانی کا جو بھی سچ ہے میں اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ معاملات چل رہے تھے' میں تجھے روکنا چاہتا تھا' مگر تیری آنکھوں کا سرور' خوشی اس نے مجھے خود غرض بنا دیا' میں تجھے اتنا ہی کامیاب دیکھنا چاہتا تھا جتنا تو اس وقت ہو رہا تھا۔ مگر اس کی قیمت بہت بڑی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ تو اس وقت خود اقرار کرے' مگر تیرا موڈ یہ نہیں تھا' ہاں میں نے ایک اچھا دوست ہونے کا ثبوت نہیں دیا' مگر میں بس دوست تھا' سماج سیوک نہیں' میں ان بہت سارے لوگوں میں سے ایک تھا جو گھر کے ڈرائنگ رومز' کیفے ہر جگہ چائے کی پیالی میں طوفان کی بات تو کرتے ہیں' مگر موقع پڑنے پر کمر دکھا دیتے ہیں' تجھے کیا لگتا ہے تو جو عالیان بھائی کے ٹاسک کی پروگریس بتاتے وقت ہمیشہ میری آنکھوں سے آنکھیں بچا کر جھکا کر بات کرتا تھا تو مجھے پتا نہیں چلتا کہ تو رونگ ہے ٹوٹلی رونگ۔" آفندی کسی بچے کی طرح اس کے سینے سے آن لگا تھا۔ پھر سے رو پڑا تھا' یہاں تک کہ مطلع صاف ہوا تو وہ شام گئے جلدی جلدی مچانے لگا تھا جانے کی تب آفندی نے بھنا کر کہا تھا۔

"کس کے لیے گھر جانا ہے تجھے' کون ہے جو تیرا انتظار کر رہا ہے وہاں' مت جانا آج ہم اپنی ساری پرانی باتیں کرتے ہیں۔"

"پرانی کیوں نئی باتیں کریں گے' مگر جان من گھر میں تین دن سے ابا آئے ہوئے ہیں۔"

"یعنی تین دن سے تیری غیر حاضری اسی وجہ سے تھی۔" مسکرایا پھر بولا۔

"ہاں تین دن پہلے ابا کا فون آیا تھا انہیں سخت بخار تھا کوٹھی میں کوئی ان کی دیکھ بھال نہیں کر رہا تھا' تب ابا نے مجھے فون کیا' کہنے لگے میں بہت برا انسان ہوں' مگر یار میرا بھی دل چاہتا ہے تیری ماں کی طرح میری بھی قبر ہو جس پر تو دنیا دکھاوے کو ہی سہی فاتحہ پڑھنے ضرور آئے۔"

"میں نے کہا ابا فاتحہ پڑھوانی ہے تو مر کر دکھانا ہوگا۔" ایکدم سے اموشنل ہوگئے' کہنے لگے۔

"تجھے کیا لگتا ہے میں زندہ بھی تھا۔ ادھر دیکھ میں جو سمجھتا تھا میں اور تیری ماں ہمیشہ محبت کا ناٹک کرتے رہے تھے۔ سچ پوچھ تو اس کمال عورت نے اپنا اتنا عادی بنادیا کہ ہر عورت میں' میں اسے ڈھونڈتا ہوں' وہ نہیں ملتی تو میرا ہر معاشقہ اپنی موت آپ مرجاتا ہے' اب باقی کی زندگی اس کے نام گزارنی ہے۔" میں نے کہا۔

"ابا کچھ زندگی بچی ہے' ابھی تو فاتحہ اور قبر کی بات کررہے تھے تو کہنے لگے بے چارگی سے' آجاتا خبیث کچھ بھی سہی برا یا بھلا تیرا باپ ہوں تو چاہتا ہے ایدھی والے اس بڈھے کی لاش کو دفنا میں' ماتم ہو نہ فاتحہ سارا مزا کرکرا ہوجائے گا۔"

"بس دل پسیج گیا ابا کو لے آیا گھر اب تو پھر سے نخرے ہورہے ہیں۔"

"میں بھی چلوں تیرے ساتھ۔" وہ تنہائی کے خیال سے بے چارگی سے بولا اور وہ ہنس پڑا۔

"دیکھ ایک جان ہے میری دو بچوں کو نہیں سنبھال سکتا۔"

"تو سب کرسکتا ہے تو ہیرو ہے میں ہے میری جان۔"

"چل اتنی تعریف پر تو راضی ہونا پڑے گا۔"

وہ دونوں سیڑھیاں اترنے لگے تھے جب آفندی کے موبائل پر میسج ٹون بجی تھی۔

میں بنے تنہا بوئے
خوابوں کی اس دھرتی میں
پودے خوشبو کے

اس نے فون ملایا تھا' ریسیو کرنے والی علینہ ہی تھی۔

"کچھ تو بولو۔" وہ بے قراری سے پکار اٹھا۔

"میں نے ایک نئی ایکس کلوزو رپورٹ یوٹیوب پر ڈال دی ہے مسٹر احمد درانی' وکی لیکس کو بھول جائیں گے' عالیان بھائی نے مجھے ہمیشہ ایک بات سکھائی تھی' برائی سے نفرت کرو برے انسان سے نہیں اور تم میں اتنا حوصلہ موجود ہے کہ تم حکومتی ایوان ہلا سکتے ہو میں نے عالیان بھائی کا کیس نئے سرے سے اسٹڈی کیا ہے اور ان سارے ناموں کو بے نقاب کیا ہے جنہوں نے انہیں آج اس حال کو پہنچایا ہے کیا تم میری اس سلسلے میں مدد کرو گے۔" اس نے گہرا سانس لیا تھا اور نرمی سے بولا تھا۔

"ساری سی ڈیز' سارا مواد جو میں نے اپنی بچت کے حوالے سے جمع کیا تھا تمہارے پاس آذر کے ذریعے پہنچ جائے گا۔ رہی میری بدنامی تو وہ موت کی طرح ایک بار ہی ہوسکتی ہے جو ہوچکی ہے' مگر تمہارے اس کیس فائل سے میرے گناہ کی سزا کم ہوجائے گی۔"

"گناہ کی توبہ کرنے والے مومن بن جاتے ہیں اور مجھے ایک توبہ بھرے دل کا ساتھ ساری عمر کے لیے قبول ہے' اگر تم میری غلطیوں کو بھول سکو۔"

"تمہاری غلطیاں میری خودسری کی مزاحمت اور میری غلط طور پر کمائی ہوئی کامیابیوں پر کیے جانے والے غصے کا ردعمل تھا۔"

"تو میں کیا سمجھوں۔" اس نے مزید وضاحت مانگی۔ اور وہ گنگنایا تھا۔

تیری کوشش تیری تدبیر ہونا چاہتا ہوں
میں تیرے ہاتھ کی تحریر ہونا چاہتا ہوں

تو میرے پاس آئے اور پلٹ کر نہ جائے
میں تیرے پاؤں کی زنجیر ہونا چاہتا ہوں

میں اس لیے تباہ خود کو کررہا ہوں
کہ تیرے ہاتھ سے تعمیر ہونا چاہتا ہوں

علینہ کی محسوس کی جانے والی مسکراہٹ اس کے گرد حصار ہوگئی تھی اور وہ ہر سود و زیاں سے بے گانہ ہوگیا تھا کہ ایک ہاتھ میں محبت تھی' ایک ہاتھ میں رشتوں کی سچائی اور دل میں توبہ کا احساس اور اب زمانہ بہ اپنی ناکامی کو چھو کر جی کر ایک نئی کامیابی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور وہ خوش نصیب تھا کہ مرنے سے پہلے جی اٹھا تھا۔

☆ ☆

طلسم عشق تھا سب

سعدیہ عزیز آفریدی

وہ ابھی دفتر میں آکر بیٹھا ہی تھا انداز میں بے زاری اور کوفت چھلک رہی تھی۔

آج کل فارغ تھا جرنلزم میں ماسٹر کی ڈگری لے کر کسی اخبار میں جاب کرنے کا خواہاں تھا جس میگزین میں وہ فی الحال کام کر رہا تھا وہ پاپا کے قریبی دوست کا تھا۔ ان کے بے حد اصرار پر اس نے یہ ذمہ داری قبول تو کرلی تھی لیکن اب وہ اس کام سے کچھ کچھ اکتانے لگا تھا اس کی وجہ شاید اس کی متلون مزاجی تھی یا انکل کی حد سے زیادہ دی گئی رعایت اب کچھ اور کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ اپنے خیالات کو کسی ایک نقطہ پر مجتمع کرتا اس کے کمرے کا دروازہ ہلکی سی دستک کے بعد کھلا۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں۔" ایک نہایت سریلی آواز اس طرح سماعت سے ٹکرائی کہ اس نے بے ساختہ اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھیں دروازے کی طرف اٹھائیں اور اس کے دماغ میں "فوراً" ہی یہ شعر تازہ ہوا۔

مٹا دیا مجھے عشق نے مجاز مگر
ستانے والے ابھی تک ستائے جاتے ہیں

"سر کیا میں اندر آسکتی ہوں۔" دروازے پر کھڑی حسین دوشیزہ نے گھبرا کر پھر سے اجازت طلب کی تو وہ اجازت دے کر خاموشی سے اسے دیکھے گیا اس کی محویت نہ ٹوٹی تو آنے والی دوشیزہ گلا کھنکار کر گویا ہوئی۔

"مجھے رمشا کہتے ہیں سر۔"

اس نے سنا اور دل میں سوچا پہلی مرتبہ کسی کے والدین نے نام رکھنے میں ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

"جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"نہیں، جی میری مجال کہ آپ سے کچھ کہہ سکوں ویسے آپ کی اس آمد کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" وہ فوراً اپنی اسی جون میں آگیا تو رمشا حسین نے مسکرا کر مدعا بیان کیا۔

"وہ جی میں نے اپنا ایک افسانہ بھجوایا تھا اس کے متعلق پوچھنا تھا، قبول کیا گیا یا رد ہو گیا۔"

"اچھا آپ نے افسانہ بھجوایا تھا لیکن یہ تو آپ فون کرکے بھی پوچھ سکتی تھیں، ویسے افسانے کا نام کیا تھا۔"

"بہت مختلف سا نام تھا دراصل میں افسانہ بھی بہت ہٹ کر لکھنا چاہتی ہوں میں روایتی افسانہ نگاروں سے بالکل الگ رہ کر چلنے کی خواہاں ہوں بس مجھے چھوٹی موٹی کامیابی کے خیال کی بجائے میری نظر ہمیشہ بڑی کامیابی پر مرکوز رہتی ہے میں ادب میں کچھ کرنا چاہتی ہوں ایسا کام کہ لوگ دیر تک یاد رکھیں۔"

"واہ آپ کے خیالات تو بہت نادر ہیں ویسے افسانے کا نام بتا دیتیں تو آسانی رہتی۔"

اس کی باتوں سے مرعوب ہونے کے باوجود وہ سنجیدگی سے بولا تو رمشاء حسین نے لمحہ بھر کو آنکھیں بند کیں پھر مراقبے کی کیفیت سے نکلے بغیر بولی۔

"افسانے کا نام شاید نہیں یقیناً "یہ عجب میری محبتیں تھا۔"

"نام تو کافی اٹریکٹیو ہے دیکھئے تلاش کرتا ہوں۔" یشل ذکی نے سامنے دھرے نوک پلک سنوارنے کا انتظار جھیلتے افسانوں کے پلندے کو چھیڑا ... طلوبہ

افسانہ نہ ملا تو کمرے میں ایک کونے میں رکھے ریک کی طرف جانے کے لیے اٹھا پھر پلٹ کر رمشا حسین کی آنکھوں میں اپنے فن کی ناقدری پر احتجاج دیکھا تو لحہ بھر کو رک گیا پھر وضاحت کے لیے بولا۔

"دراصل آج کل کام بہت ہے ناں دن میں کتنے ہی افسانے ہمیں موصول ہوتے ہیں اس لیے مشکل ہو رہی ہے۔"

"مگر یہ کوئی اچھی بات تو نہیں آپ کو معلوم نہیں کہ یہ تحریریں قارئین کی زندگیوں پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہیں۔" اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہاں تو یہ ہے یہ عجب میری محبتیں" وہ کپڑے جھاڑتا واپس اپنی ریوالونگ چیئر پر آبیٹھا افسانہ سامنے رکھا پھر پہلا جملہ ہی پڑھا تھا کہ چودہ طبق روشن ہو گئے پہلا جملہ ہی چونکا دینے والا تھا لکھا تھا۔

"آپ نے کبھی خرگوش کو چشمہ لگاتے دیکھا ہے۔"

"یہ یہ افسانہ ہے کیا آپ نے سنجیدگی سے افسانہ لکھا تھا۔"



"کیا مطلب ہے' آپ کا خیال ہے میں اتنی فارغ ہوں کہ جوکنگ کرتی پھروں گی۔"

"نہیں دیکھیے برا مت منایئے لیکن یہ کیا جملہ ہوا آپ نے کبھی خرگوش کو چشمہ لگاتے دیکھا ہے؟" اس نے مسودے کی طرف اشارہ کیا تو وہ مسکرائی۔

"دراصل یہ ایک بالکل نیا استعارہ ہے تمام رائٹر چاند ستارے اور پتا نہیں کس کس چیز کو بطور استعارہ استعمال کر سکتے ہیں تو میں نے کیا برا کیا جو یہ سوچ لیا آخر خرگوش کا کیا قصور' اس لیے محبت کے آفاقی جذبے کو ظاہر کرنے کے لیے میں نے اس جملے کو استعمال کیا۔"

"مگر مس رمشا محبت اور خرگوش کچھ عجیب بات نہیں لگتی؟"

"لگتی ہے اس لیے کہ نئی چیز ہے آپ کو حیرت ہوئی تھی ناں پہلی بار جب فلموں میں بیک وقت ایک کرکٹر اور ہاتھی کو یکجا کیا گیا تھا۔"

"لیکن یہ حیرت سے زیادہ عبرت انگیز تھا ہاتھی کیا کم تھا کہ کرکٹر بھی۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں جس طرح یہ استعارہ ابھی سوٹ نہیں کر رہا مگر لوگ آگے چل کر اسے ادب عالیہ میں مقام دیں گے' خرگوش محبت کا ایک سمبل ہے محبت ہی کی طرح خوب صورت سہما ہوا گاجریں کھاتا ہوا۔"

"باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ گاجریں کھانا محبت کی علامت کیسے ہوا۔"

"دراصل چونکہ محبت اندھی ہوتی ہے اس لیے گاجریں کھانے سے مراد محبت میں اسی ٹرینڈ کو سامنے لانا ہے کہ محب کو محبوب کی اندھی تقلید کرنے کی بجائے آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔"

"مجھے آپ سے اتفاق ہے۔"

"مگر لگ رہا ہے آپ میری بات سنجیدگی سے نہیں سن رہے۔"

"میں اتنی دیر سے آپ ہی کو تو سنجیدگی سے سن رہا ہوں ویسے آپ کا یہ افسانہ میں خصوصی طور پر پڑھنا چاہتا ہوں تین دن دیجیے اس خرگوش کو ہضم کرنے میں۔"

"ٹھیک ہے مسٹر یشل میں تین دن بعد فون کر کے معلوم کر لوں گی۔"

"کیوں نہیں مس رمشا لیکن دیکھیے آنے سے پہلے فون ضرور کر لیجیے گا۔"

"جی بہتر آئندہ خیال رکھوں گی۔" وہ سلام دعا کرتی اٹھ گئی اسی وقت ایڈیٹر صاحب آ گئے۔

"کیوں یشل کچھ پریشان ہو۔" وہ اس کے تاثرات دیکھ کر پوچھ بیٹھے۔

"اس وقت میں محبت کے لافانی جذبے کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہوں اور۔"

"اور یہ کہ کاش یشل زکی آپ باتوں کے سوت کات کات کر ڈھیر لگانے کی بجائے کام بھی کر سکتے تو میں کتنا آسودہ ہوتا۔" انہوں نے آہ بھر کر کہا یشل زکی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر صرف ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

ایڈیٹر صاحب گردن جھٹک کر آگے بڑھ گئے تو وہ واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھا پھر افسانہ پڑھنے لگا جو افسانے کے علاوہ سب کچھ تھا یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نفسیات داں نے اپنا سارا علم بے ترتیبی سے ایک ہی جگہ ٹھونس دیا ہو اس نے گھبرا کر مسودہ پٹخ دیا اسی وقت سیکرٹری نے اندر جھانکا۔

"اوہ مس زوہا آپ ہیں؟ آیئے ناں پلیز۔"

"مسٹر یشل مجھے تو اندر آنا ہی تھا مجھے معلوم ہے آپ حسب عادت فارغ ہوں گے۔"

"مس زوہا آپ بھی اور سب لوگوں کی طرح طنز کر رہی ہیں۔"

"نہیں خیر میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں یہ بتانے آئی تھی کہ آپ کے آنے سے پہلے گھر سے فون آیا تھا آپ کو فوراً" گھر بلوایا گیا ہے۔"

یشل زکی نے گھڑی دیکھی ابھی آفس ٹائم ختم ہونے میں بہت وقت تھا پھر وہ سر سے اجازت لینے ان کے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن انہوں نے جاتے جاتے بھی دو تین کام اسے تھما ہی دیے کام سے فارغ ہو کر وہ جس وقت گھر پہنچا بابا کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔

ڈرائنگ روم سے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ کھلے دروازے سے وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا حیرت سے چیخ اٹھا۔

"موعود بھائی آپ اتنے اچانک۔"

"جی میں اتنا اچانک نہیں آیا یہ سرپرائز ہے کیا تمہیں پسند نہیں آیا۔"

"پسند کی بات چھوڑیئے میں تو خوشی سے پاگل ہو گیا ہوں۔"

"خیر یہ نئی خبر نہیں بابا نے تو بہت پہلے مجھے مطلع کر دیا تھا کہ ہاتھ دھو رکھو یشل سے۔"

"موعود بھائی آپ بھی تنگ کرنے لگے۔"

وہ مسکرا کر ان کے سینے سے جا لگا تو موعود زکی کی آنکھوں میں محبت شوخی سب یکجا ہو گئے کتنے طویل عرصے بعد وہ اپنے اس بھائی کو دیکھ رہا تھا جو بظاہر ان سے جدا تھا مگر درحقیقت ان کے دل ہی میں رہتا تھا جو تنہائی میں ان کا مونس اور یار دلدار تھا جس کے طویل طویل خط دیار غیر میں بھی انہیں اپنے دیس سے اجنبیت نہیں محسوس ہونے دیتے تھے وہ آنکھیں بند کرتے اپنوں سے دوری کو لمحوں کے لیے بالکل بھول جاتے یاد رہتا تو صرف اتنا کہ وہ تنہا نہیں ہیں اس تنہائی میں بھی اپنوں کا جمگھٹا انہیں گھیرے ہوئے ہے ہر دکھ سکھ شیئر کرنے سب کچھ وارنے پر کمر بستہ ہے۔

"کیا سوچنے لگے آپ....."

"کوئی خاص نہیں' ویسے کافی صحت مند ہو گئے ہو۔" انہوں نے اس کی صحت کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہنسنے لگا۔

"آپ چلے گئے تھے پھر بتایئے میں کرتا بھی کیا' تنہائی میں ہمیشہ بھوک غالب آ جاتی ہے اس لیے جو حال نہ ہوتا کم تھا۔"

"یعنی تم ابھی تک نہیں سدھرے۔"

"بے فکر رہیں آئندہ بھی سدھرنے کا کوئی امکان نہیں۔"

وہ بھائی کا ہاتھ تھامے صوفے پر جا بیٹھا بابا نے دونوں کی وارفتگی دیکھی تو اٹھ کر ضروری فون کرنے چلے گئے۔

موعود زکی دیار غیر میں گزرے ایک ایک دن کی روداد بیان کرنے میں لگے ہوئے تھے بات انیقہ رشید پر آ کر رکی تو یشل زکی شوخ ہو گیا پھر بولا۔

"سچ پوچھیے تو انیقہ بھابھو آپ کے ہجر میں پہلے سے کہیں زیادہ گریس فل ہو گئی ہیں اتنی زیادہ کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ کوئی میرے لیے بھی اس طرح دل و نگاہ فرش راہ کیے بیٹھا رہے اور زندگی کی شام ہو جائے۔"

"شام کیوں صبح کیوں نہیں۔"

"صرف اس لیے کہ مجھے صبح کی روشنی سے کہیں زیادہ ڈوبتا سورج اٹریکٹ کرتا ہے۔"

"تم قنوطیت پسند ہو گئے ہو روشنی کی بجائے اندھیرے کی خواہش بہت بری بات ہے۔"

"ہو سکتا ہے بری بات ہو لیکن موعود بھائی حقیقت میں مجھے غروب ہوتے سورج کی قنوطیت نہیں بلکہ اندھیرے سے آخر لمحے تک لڑتے رہنے کی اسٹرگل متوجہ کرتی ہے۔"

"ہوں یہ بات ماننے والی ہے اچھا سنو وہ تمہاری منگیتر کا کیا حال ہے۔"

"بد حال سمجھیے میں نے تو کبھی پلٹ کر خبر بھی نہیں لی محترمہ ہیں کون' اس کی بھی تمنا نہیں کی۔"

"کیا مطلب کبھی بالمشافہ بات نہیں ہوئی کیا۔"

"نہیں بس فون پر ہیلو ہائے ہو جاتی ہے کبھی کبھی' ویسے پاکستان سے گلف یوں بھی تو بہت دور ہے نا۔"

"لیکن بابا تو کہہ رہے تھے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آ چکی ہیں۔"

"یقیناً" آ چکی ہیں لیکن یہاں آ کر بھی ان کی روبرو نہ آنے کی ضد نہیں ٹوٹی ان کا کہنا ہے شادی کرو اور صرف نکاح کے بعد ان سے ملاقات کرو مجبوری ہے۔"

"لیکن تم نے یہ بات کیسے مان لی۔"

"جیسے آپ نے دیکھے بنا انیقہ بھابھو کو تسلیم کر لیا تھا یعنی انیقہ بھابھو کی طرح یہ محترمہ بھی بابا جی کو اس قدر بھا گئی ہیں کہ صرف اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کی جوابی ضد میں..... میں انہیں ہرٹ نہیں کر سکتا۔"

"لیکن یار تمہارے استقلال کے باوجود میں یہی

کہوں گا کہ تمہارا اور میرا معاملہ ایک جیسا نہیں ہے انیقہ کا سلسلہ دوسرا تھا وہ اور میں بچپن میں ایک ساتھ پلے بڑھے تھے اس لیے ایک دوسرے کا مزاج ہی نہیں شکل و صورت آشنا بھی تھے لیکن یہاں تو۔"

"یہاں تو بس اللہ کا آسرا ہے اس لیے دل کڑا رہنے دیجیے خوامخواہ خوفزدہ مت کیجیے مجھے' جو ہو گا سامنے آجائے گا۔"

"اے یو تش بھئی" وہ ہنسنے لگے۔

گھر میں نوکروں کی فوج ظفر موج تھی لیکن خود سے قریبی رشتے مفقود۔ تھے بابا اکلوتے تھے تو ممی کے تمام رشتے دار بیرون ملک مقیم تھے اور ریشل کی منگیتر بھی ممی کے بھائی ہی کی بیٹی تھی موعود بھائی کی منکوحہ پاپا کے دوست رشید سجاد کی لاڈلی بیٹی تھی۔

ان کی شادی بھی بہت ایمرجنسی میں ہوئی تھی موعود بھائی ان دنوں اعلا تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتے تھے بابا کو ویسے تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن پھر بھی جوان بیٹے کو تنہا بھیجنا انہیں کسی طرح برداشت نہ ہو رہا تھا ماں جیسا حساس رشتہ بھی نہیں تھا جو بیٹے کو اس ضد سے باز رکھنے میں کامیاب ہوتا اس لیے انہوں نے اجازت اس شرط کے ساتھ دی کہ وہ یہاں واپس لوٹنے کا کوئی عہد کر کے جائیں جس کی زنجیر انہیں وہاں کی رنگین دنیا میں گم نہ ہونے دے اس فیصلے کے لیے انہوں نے انیقہ کا نام تجویز کر دیا۔

موعود نے بغیر پلا پس و پیش کے ہامی بھرلی نکاح کر دیا گیا رخصتی ان کے آنے تک ملتوی کر دی گئی یوں وہ چلے گئے مگر درحقیقت یہیں رہے ہر لمحہ اپنے سرد و گرم جھیلنے والے بابا کے ساتھ اور آج لوٹے تھے تو گھر میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا چھ سال میں کچھ بھی تو تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ موعود غور سے ارد گرد دیکھ رہے تھے۔

"یوں کیا دیکھ رہے ہیں کیا پہچانا نہیں جا رہا گھر۔"

"واہ یہ کیا بات کہی تم نے! گھر میں بدلا ہی کیا ہے جو پہچانا نہیں جائے گا۔"

"ارے اتنا کچھ تو بدل دیا ہے یہ دیکھیے یہ بک ریک مشرق سے مغرب کی طرف آ گیا اور سب سے بڑھ کر میں بہت بدل گیا ہوں۔"

"کیا بدلے ہو کیسے بدلے ہو وضاحت کرو گے۔"

"کیوں نہیں دیکھیے میرے قد میں پورے پانچ انچ کا اضافہ ہوا ہے اور عمر بیس کے بجائے چھبیس سال ہے اور مزید یہ کہ اب رات کو سوتے میں مجھے ڈر بھی نہیں لگتا اس لیے ثابت ہوا کہ میں۔"

"ثابت ہوا کہ بہت کچھ بدل گیا' میری جان میں اتنی حیران کن تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ ماننا پڑے گا وقت ہر چیز کو بدلنے پر قادر ہے اچھا سنو میں ذرا نہانے جا رہا ہوں اس لیے انیقہ کا فون آئے تو کہہ دینا ہم رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔"

"جی بہت بہتر......" اس نے سر ہلایا لیکن شرارتاً فون نہ کیا موعود بھائی تیار ہو کر آ گئے تو دونوں بھائی پاپا کو اپنی اگلی مصروفیت بتا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

انیقہ بھابھو کچن میں مصروف تھیں اسے دیکھا تو حیرت کا قطعاً اظہار نہ کیا۔

"بھابھو کیا ہماری آمد نے آپ کو بالکل حیرت زدہ نہیں کیا۔" انیقہ بھابھو ہنس کر بولیں۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ بندی تمہاری آمد کی خبر سے لاعلم نہیں انکل نے مجھے دوپہر کو ہی فون کر دیا تھا۔"

"چلیے مان لی یہ بات' لیکن جناب کو یہ تو نہیں معلوم کہ آج ہم خصوصی طور پر کس کام سے آئے ہیں۔"

دھک دھک کرتے دل سے انیقہ بھابھو نے اسے دیکھا تو اس نے داہنا ہاتھ فضا میں بلند کیا پھر بولا۔

"میں محبت کی عدالت میں آج صرف سچ بولنے آیا ہوں اور سچ یہ ہے کہ یہ اعلا عدالت آپ کی سزائے ہجر ختم کرنا چاہتی ہے۔" انیقہ بھابھو نے شرما کر سر جھکا لیا تو وہ مختلف ڈشز کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر جھانکنے لگا پھر بولا۔

"بھابھو ساری بھائی کی پسندیدہ ڈشز پکائی ہیں میں یاد نہیں رہا کیا......" وہ جواب کی بجائے ہنس پڑیں اور وہ بے مزا ہونے کا تاثر دیتا واپس ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا پھر کھانا لگنے تک پاپا بھی آ پہنچے تو کھانا نہایت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔

وہ تینوں کھانے کے بعد یونہی باتیں کرنے لان میں آ بیٹھے اندر بزرگ حضرات انیقہ بھابھی کی رخصتی کے لیے تاریخ طے کرنے لگے۔ ریشل سنجیدہ نہیں ہوتا تھا مگر یہاں وہ بہت سنجیدہ تھا موعود بھائی اور انیقہ بھابھو خوشگوار دنوں کے خواب بن رہے تھے اس لیے اس سے غافل تھے لیکن پھر انیقہ بھابھی نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تو سر اٹھا کر اسے توجہ سے دیکھا پھر پوچھا۔

"کیا ہوا میرے چھوٹے بھائی تم اتنے افسردہ کیوں ہو؟"

"بس ممی یاد آ رہی تھیں' کاش وہ اس خوشی کو ہمارے ساتھ شیئر کر سکتیں۔" اس کا لہجہ بھرا گیا اور موعود بھائی جو اس سے دور بیٹھے تھے اٹھ کر اس کے قریب آ گئے پھر کھینچ کر سینے سے لگا کر بھرے بھرے لہجے میں بولے۔

"تمہیں یہ کیوں لگا کہ ممی ہم سے دور ہیں اور یہ کہ وہ ہماری خوشیاں شیئر نہیں کر سکتیں' ادھر دیکھو یہاں کون دھڑکتا ہے۔" انہوں نے سینے کی طرف اشارہ کیا پھر مزید بولے۔

"ماں اور محبت' محبت اور زندگی کے علاوہ کیا ہے اس وجود میں۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"پھر یہ خیال دل سے نکال دو کہ وہ ہماری خوشیوں میں ہمارے ساتھ شریک نہیں' ان کا وجود ہماری ظاہری نگاہ سے اوجھل ہے مگر ریشل وہ باطنی طور پر ہمارے بہت قریب ہیں دل میں دھڑکنے والی محبت کی طرح ان کی دعائیں اب بھی ہم پر سایہ فگن ہیں جس طرح ہم اپنی ہر خوشی کو ان کے وجود کے بغیر ادھوری سمجھتے ہیں اسی طرح وہ ہم سے دور رہ کر بھی ہمارے قریب ہیں۔"

ریشل نے مان لینے والے انداز میں سر جھکا لیا پھر وہ تینوں رخصت ہو کر گاڑی میں آ بیٹھے ایک مہینے بعد رخصتی کی تاریخ طے کی گئی تھی بہت کم وقت تھا اس نے آفس سے کچھ دنوں کی چھٹی لے لی اور موعود بھائی کے ساتھ مل کر شادی کے ضروری کام نبٹانے میں لگ گیا۔ دعوت ناموں کا مرحلہ آیا تو بھائی موعود نے اس موقعے پر ریشل کی منگیتر اور اس کی فیملی کو بلانے کا سوال اٹھایا لیکن پاپا نے ہولے سے منع کر دیا بقول ان کے وہ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس شادی میں شریک نہ ہو سکیں گے۔

موعود بھائی کی شادی خانہ آبادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ شادی کے دوسرے دن ہی وہ دونوں شمالی علاقہ جات دیکھنے کا پروگرام بنا کر عازم سفر ہو گئے تو وہ پھر سے تنہا ہو گیا۔ اس دن وہ پورے ڈیڑھ مہینے بعد دفتر آیا اپنی سیٹ پر بیٹھا مسودہ پڑھ ہی رہا تھا کہ فون کی بیل بجی۔

"ہیلو ریشل زکی' اوہ آپ ہیں' جی مس رمشا میں فارغ ہوں پلیز آ جائیے' جی جی آپ کے اس افسانے پر بھی بات ہو گی ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔"

پھر وہ چائے پی رہا تھا جب رمشا حسین پہلے کے سے انداز میں آنے کی اجازت مانگ کر اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی پھر اسی نے سلسلہ کلام جوڑنے میں پہل کی۔

"میں پچھلے ڈیڑھ مہینے سے آپ کو فون کر رہی ہوں مگر آپ کے دفتری کولیگز کہتے تھے آپ دفتر ہی نہیں آ رہے خیریت تو تھی آپ کی طبیعت تو ٹھیک تھی۔"

"جی ہاں طبیعت کو کیا ہونا تھا' بس ویسے ہی کچھ ذاتی مصروفیات آڑے آ گئی تھیں ورنہ میں دفتر کو اتنا اگنور نہیں کرتا۔" اس نے کچھ دیر توقف کیا پھر جھجکتا ہوا بولا۔

"مس رمشا حسین یہ جو آپ کا افسانہ ہے نا "یہ عجب میری محبتیں" اس میں آپ نے محبت کی جن پرتوں کو نفسیات کے اصول و ضابطوں پر پرکھا ہے یہ غیر معمولی ذہانت کی بات ہے ویسے آپ کا پسندیدہ مضمون کیا نفسیات ہے۔"

"جی بالکل درست اندازہ لگایا میں سائیکاٹرسٹ ہوں لیکن فی الحال ابھی اپنی پریکٹس نہیں شروع کی۔"

"میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا صرف آپ ہی محبت اور خرگوش کی آفاقی جذبے کو پرموٹ کر سکتی ہیں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"چھوڑیے کوئی اتنی خاص بات بھی نہیں تھی

ویسے آپ کو پڑھنا تو بہت پڑتا ہوگا ڈاکٹری ہو یا وکالت ان چیزوں کے لیے تو بہت ٹائم چاہیے ہوتا ہے۔"

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں دماغی طور پر آؤٹ آف کنٹرول ہوں۔"

"نہیں بھلا یہ آپ کو غلط فہمی کیوں ہوئی ہے مس رمشا۔" اس نے ہنس کر تردید کرنا چاہی مگر آنکھوں میں اتنا واضح لکھا تھا "پاگل ہی ہے" کہ رمشا حسین کو پتنگے لگ گئے پھر کچھ سوچ کر رمشا حسین نے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے اور ہولے سے بولی۔

"آپ کو اس افسانے پر آخر کیا اعتراض ہے۔"

"دیکھئے اس افسانے پر میرا پہلا اور آخری اعتراض یہ ہے کہ یہ افسانے کے معیار پر پورا نہیں اترتا ایک وقت تھا کہ نفسیاتی افسانوں کی مانگ تھی اور ان افسانوں میں بھی کوئی خیال ضرور ہوتا تھا ایک وقت آیا کہانی غائب کر دی گئی، مگر در پردہ خیال پھر بھی غائب نہیں ہوا اس ہی لیے برسوں بعد بھی افسانہ ابھی تک زندہ ہے لیکن اس افسانے میں نہ کہانی ہے نہ کوئی خیال یہ تو بس محبت کی جہتوں کی عقدہ کشائی کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"یہی تو اس کی کوالٹی ہے، خیر چھوڑیئے یہ آپ کی اپروچ سے اوپر کی چیز ہے، لیجئے آج میں آپ کے لیے ایک اور افسانہ لے آئی یہ پڑھیے پھر رائے دیجیے۔"

اس نے شولڈر بیگ میں سے نیا مسودہ سامنے رکھ دیا۔ یشل زکی نے مسکرا کر صفحات اٹھائے۔

"مجھے یقین ہے اس میں آپ کے قلم کی جولانیاں عروج پر ہوں گی۔" کہہ کر اس نے افسانہ پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

"وہ صبح سے اداس تھا اس لیے اسے کچھ نہ سوجھا تو اس نے اپنے ملازم کو آواز دی پھر حکم دیا کہ ایک گلاس اورنج جوس پینا چاہتا ہے اس جوسر بلینڈر سے نکلا ہوا جو اس کے پاپا امریکا سے لائے تھے ملازم نے حکم کی تعمیل کی پھر پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ کرسٹل کے گلاس میں جوس پی رہا تھا گلاس کا یہ سیٹ اس کے پاپا فرانس سے لائے تھے سو وہ جوس اور پاپا کی چوائس کی داد دیتا اٹھا باہر نکلا تو دس لاکھ کی گاڑی میں جا بیٹھا اور سستی سی زندگی کو مہنگے ترین سگریٹ کے دھوئیں میں رکھ کر اڑانے لگا گولڈ لائٹر اس کے ہاتھ میں تھا جو اس کے چچا نے اسے گلف سے بھیجا تھا اور وہ لائٹر کا شعلہ بار بار جلاتا بجھاتا ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ۔۔۔"

"کہ یہ مسودہ یہاں لانے کی بجائے اس لائٹر سے نکلتے شعلے کی نظر کیوں نہ ہوا۔" اس نے آگے کا جملہ خود ہی پورا کیا پھر اس کی طرف دیکھا۔

"مس رمشا حسین کیا آپ بتائیں گی کہ یہ افسانہ لکھنے کا محرک کیا تھا؟"

"دراصل میں اس افسانے کے ذریعے بتانا چاہتی تھی کہ خوشی سکون دولت جیسی چیز میں پنہاں نہیں۔"

"لیکن مس رمشا یہ بات تو کسی اور طریقے سے بھی ظاہر کی جا سکتی تھی اس کے لیے آپ نے ہر چیز کی قیمت کیوں تحریر کی، آپ کو انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے بھی ڈر نہیں لگتا۔"

رمشا حسین ہنسنے لگی پھر ادا سے مسکرا کر بولی۔

"دراصل میری کہانی کا ہیرو ہر معاملے میں فیئر رہنا چاہتا ہے وہ جیسا اندر سے ہے ویسے ہی باہر سے بھی دکھائی دینا چاہتا ہے پھر ابھی تک اس نے سیاست میں آنے کا فیصلہ بھی نہیں کیا اس لیے اپنے اثاثے چھپانا وہ بزدلی سمجھتا ہے۔"

"لیکن مس رمشا اس طرح کے اظہار سے تو لگتا ہے جیسے آپ کی تحریر کا ہیرو کہیں سے ملنے والی تازہ تازہ دولت کے بل پر دوسروں کو مرعوب کرنا چاہتا ہے دیکھئے ایسی تحریر بھی ہمارے رسالے میں نہیں چل سکتی میرے ایڈیٹر صاحب اس بات کی اجازت نہیں دیں گے میں غریب ایک ادنیٰ سا ملازم ہوں اور پھر دولت و عیش کی اس قدر کھلی فراوانی دکھا کر ہم اپنے قارئین کے ناآسودہ جذبوں کو مہمیز نہیں دے سکتے۔"

"لیکن ایسی تحریریں تو آپ کے رسالے کی جان ہوا کرتی ہیں جس میں ہیرو مہنگی سے مہنگی گاڑی میں گھومتا اور محلوں میں رہتا ہے میں نے تو بہت کم ایسے افسانے پڑھے ہیں جس میں ہیرو مڈل یا لوئر کلاس سے تعلق رکھتا ہو۔"

"آپ نے درست فرمایا، لیکن ایسے کسی افسانے یا ناول میں اگر آپ نے غور سے پڑھا ہو تو اندازہ کر سکتی ہیں ہماری رائٹر دولت کو ثانوی حیثیت سے دکھاتی ہیں دولت کہانی کا محور نہیں ہوتی اور پھر اسے تو آپ مانیں گی نا اصل چیز خیال ہوتا ہے کلاس نہیں، پرابلم کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ کسی مقصد کی طرف لے جانا حسن کاری قلم ہے اس لیے اس کام کے لیے کوئی گھٹی بندھی تھیوری تو استعمال نہیں ہو سکتی۔"

رمشا حسین حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی سو وہ چپ ہوا تو بولی۔

"مجھے حیرت ہے مسٹر یشل پہلی ملاقات میں تو آپ بہت زیادہ نروس لگے تھے مگر آج میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ افسانے کی نا صرف تاریخ سے واقف ہیں بلکہ افسانے کے اصول اور ضابطے میں تھوڑی سی لچک پر بھی یقین رکھتے ہیں میں پوچھ سکتی ہوں پہلے دن آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ آپ کا نصب العین ہے جو طے چھاپ دو نتیجہ قارئین پر چھوڑ دو۔" یشل زکی ہنسنے لگا پھر بولا۔

"وہ سب مذاق سمجھ لیں، ویسے یہ درست ہے کہ میں نروس نیس کا شکار اکثر رہتا ہوں کبھی قابو پا لیتا ہوں کبھی ظاہر ہو جاتا ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے مسٹر یشل، بناوٹ ملمع کو تو میں خود برا سمجھتی ہوں انسان کو ہر معاملے میں فیئر رہنا چاہیے اپنی خامیوں کو چھپانے میں بعض اوقات بندہ پہلے سے کہیں زیادہ نامعقول ہو جاتا ہے۔"

یشل زکی نے کچھ دیر سنجیدگی سے اسے دیکھا پھر ہلکے سے بولا۔

"مجھے یہ سچ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس معاملے میں میں آپ کا ہمنوا ہوں دیکھئے میں ان مردوں میں سے نہیں جو مان کر بھی مردانگی کے زعم میں کسی کا خیال یا بات اس لئے رد کر دیتے ہیں کہ کہنے والی صنف نازک ہوتی ہے میں سوچ اور عمل میں حقوق نسواں اور مساوات کا بہت بڑا حامی ہوں۔"

رمشا حسین جواباً کچھ نہ بولی دونوں مسودے اٹھا کر شولڈر بیگ میں رکھنے لگی یشل زکی نے اسے خاموش دیکھا تو سوچا شاید وہ ہرٹ ہوئی ہے لیکن وہ بھی مجبور تھا اتنے اختیارات اسے بھی حاصل نہ تھے اس لئے جھوٹی تسلی دینے کی بجائے خاموش ہی رہا رمشا حسین اس کے دفتر سے نکلتی چلی گئی تو وہ اس کے اداس چہرے کو سوچ کر خود بھی اداسی محسوس کرنے لگا۔

حساس دل تھا اس لئے نہ کسی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ سکتا تھا نہ کسی کا دل توڑنے کی ہمت رکھتا تھا اور یہ کوئی نیا جذباتی موڑ بھی نہیں تھا وہ تو بچپن سے ایسا ہی تھا بقول بابا کہ۔

"یشل بظاہر تم نارمل نظر آتے ہو مگر درحقیقت کہیں نہ کہیں کسی چیز کی کمی یا زیادتی ہے تم میں جو کوئی کام ڈھنگ سے کرنے نہیں دیتی تمہیں۔" بور ہو کر وہ خود ہی چپ ہو جاتے اور وہ لاڈ سے کہتا۔

"بابا جی آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کا بیٹا حساس دل رکھتا ہے سرد مہر اور پتھر دل نہیں۔"

"ہوں یہی خیال ہے جو مجھے تمہاری الٹی سیدھی حرکتیں برداشت کرنے کی ہمت دیتا ہے ورنہ مجھے ایب نارمل لوگوں سے شدید چڑ ہے جو نہ خود کوئی کام ڈھنگ سے کرتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔"

یشل زکی یہ نادر خیالات سن کر ہمیشہ سر جھکا دیتا لیکن اس وقت یہ گزری بیتی باتیں اس میں نیا ابال اٹھانے لگی تھیں۔

آخر وہ اتنا لاابالی کیوں ہے ہر جگہ مس فٹ کیوں تھا اسے تو اپنے بابا کا داہنا ہاتھ بننا چاہیے تھا لیکن حقیقت میں وہ ابھی تک ان کا ہی زیر نگیں تھا اس نے سوچتے ہوئے آنکھیں بند کیں تو پانچ برس کا ایک چھوٹا سا بچہ اس کے دل میں ہمک کر آنکھیں مل کر جاگ اٹھا وہ تو سمجھتا تھا وہ اس بچے کو بہت عرصے پہلے کسی میلے میں گم کر چکا ہے۔ اور یہی گمشدگی ہے جو وہ اندر باہر سے یوں بے مایا بے وزن سا ہو گیا ہے۔

لیکن یہ بچہ تو شاید اس کے اندر برسوں سے یونہی چھپا بیٹھا تھا کہیں کوئی زبردست حادثہ ہوا تھا جو اس بچے نے خالی الذہنی کی حالت میں دیکھا اور صدمے سے بت ہو گیا یوں وہ بچہ یشل زکی کے ساتھ جوان نہیں

ہوسکا خوشیوں کی طرح وہیں ٹھٹھر کر رہ گیا اور آج برسوں بعد یاد آیا تو جانے کہاں سے توانائی بھر گئی تھی اس میں کہ وہ بھٹکنے لگا تھا کس کا منتظر تھا کہ وہ بت واپس اپنی قالب میں لوٹ آیا تھا ایسا کون سا تعلق تھا جو اسے ماضی کی طرف کھینچ رہا تھا بند آنکھیں اس نے کھول لیں سامنے کی کرسی کچھ دیر پہلے کسی کے وجود سے سجی ہوئی تھی لیکن اب خالی تھی۔

”یہ میں ایسا کیوں سوچنے لگا ہوں رمشا حسین سے تو صرف دوبارہ ہی ملاقات ہوئی ہے میری۔“ دل نے کہا۔

”ملاقات تو کبھی کبھی صرف ایک بار کی ہی کافی ہوتی ہے لوگ تو صرف اک نظر دیکھتے ہیں اور جیون تیاگ دیتے ہیں۔“ لیکن رمشا کی نظر میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی وہ تو اس کی باتیں اتنے غور سے سن رہی تھی جیسے وہ بہت کام کی باتیں کر رہا ہو‘ اس کے لاابالی پن اور ہونق لہجے اور اسٹائل پر آفس کے دوسرے ورکر گھنٹوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے تھے ابھی چند دن پہلے کی بات تھی جب فرخ ستار نے زوبا نظیر سے آنکھوں میں تمسخر سجا کر کہا تھا۔

”یہ یشل صاحب کیا ساری زندگی یونہی رہیں گے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان جیسے مست الست شخص کی شادی کیسے طے ہوگئی جس نے انہیں قبول کرلیا وہ لڑکی اندھی ہے کیا؟۔“

”اندھی نہیں بس تصویر کی حد تک جانتی ہے انہیں‘ تصویر سے ڈیشنگ پرسنالٹی پر مرمٹی ہوگی سارے معاملات ٹیلی فون پر طے ہوئے تھے اس لئے سوچتی ہوں بالمشافہ ملاقات میں اس پیاری لڑکی کے جذبوں کو کتنا بڑا دھچکا لگے گا۔“

اس نے سنا مگر نہ سننے کا پوز دیتا آگے بڑھ گیا یہ بات نہیں تھی کہ وہ خود کو بدلنا نہیں چاہتا بلکہ بات صرف یہ تھی کہ وہ ممی کی ڈیتھ کے بعد سے کچھ ایسا ڈسٹرب ہوگیا تھا کہ موعود بھائی کی محبت اور پاپا کا ہر دم خیال رکھنا بھی اسے اس ایب نارملٹی کے حصار سے نہیں نکال سکا پانچ برس کی عمر ہوتی ہی کیا ہے اس عمر میں تو صرف رشتے سمجھ میں آتے ہیں پھر ان کا بچھڑنا یا روٹھنا کسی طور برداشت نہیں ہوتا شخصیت درہمنت کا شکار ہوجاتی ہے سو یہی اس کے ساتھ ہوا تھا۔

وہ وقت اسے کیسے بھول سکتا تھا جب اس نے خود سے ان تینوں رشتوں ہی کو اپنی کل متاع سمجھ لیا تھا تو بس ایک دن اچانک ہی اس کی ممی اسے خاموشی سے چھوڑ گئیں وہ رویا بھی تھا چلایا بھی تھا مگر ممی نے اس کی نہیں سنی۔

ایک نازک معصوم سا جو دل تھا وہ جھٹکے سے ٹوٹ گیا ایسے کہ پھر نہ جڑ سکا۔ اس نے لاکھ کوشش کی سمجھنے کی دل کو سمجھانے کی مگر طبیعت کو ان دنوں کس بات سے تشفی نہیں ہوتی تھی ورنہ یہ محیر العقول بات تو نہ تھی دنیا میں کتنے ہی بچے ہوتے ہیں جن کے والدین عین عالم شباب میں عدم آباد کرنے چل پڑتے ہیں لیکن پھر بھی وہ زندگی اور دنیا کو مینیج کر لیتے ہیں مگر وہ یشل ذکی تھا ہر ایک کا لاڈلا سو یہ غم اس سے کسی طور شیئر نہ ہوسکا بظاہر وہ یہی ثابت کرنے پر کمر بستہ رہا کہ وہ اب اس دکھ کو پس پشت ڈال چکا ہے لیکن کمی کا جو احساس شروع دن سے ہوا جو غم اول دن سے درپیش جاں رہا اس نے اسے سنبھلنے نہ دیا۔ اس میں کسی بھی چیز کو سنجیدہ لینے کی حس ختم ہوگئی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی ممی جب اتنی غیر متوقع طور پر مر سکتی ہیں تو دنیا میں کون سا ایسا کام ہے جس پر وہ اپنی حیر میں ضائع کرے ہر کام ہونے کے لئے ہے تو اسے ہونے دو‘ پریشانی چہ معنی دارد یہی سوچ کر زندگی گزر رہی تھی۔

لیکن آج بالکل اچانک دل میں ایک تمنا جاگی تھی کہ کاش رمشا حسین سے اس کا کوئی ایسا تعلق ہوتا جس کے زعم میں وہ واقعی خود کو بدل لیتا۔

”لیکن بھلا ایسا ممکن کہاں ہے۔“ وہ اپنے خیال پر خود ہی ہنسا۔

”یشل۔۔۔ یشل۔۔۔“ کہیں قریب سے اسے پکارا گیا تو اس نے خیال سے چونک کر سامنے دیکھا سامنے کی کرسی پر پاپا محویت سے اسے تک رہے تھے۔

”ارے پاپا جی آپ۔۔۔ آپ کب آئے؟۔“

”پچھلے پندرہ منٹ سے سامنے بیٹھا ہوں لیکن آپ پتا نہیں کن سوچوں میں گم ہیں کہ خبر ہی نہیں

رکھتے ویسے آپس کی بات ہے اتنے استغراق سے کیسے سوچا جا رہا تھا۔“ اس نے فوراً اپنی کیفیت پر قابو پالیا تھا اس لئے مزے سے بات پلٹ دی۔

پھر وہ شام گئے پاپا کے ہمراہ ہی گھر لوٹا تو خود تو لائبریری میں جا گھسا اور پاپا اپنے دوست کے ساتھ برج کھیلنے کلب چل دیئے گھر میں بے حد خاموشی تھی وہ مطالعہ میں محو تھا کہ جمال بابا کو لائبریری کے دروازے پر دیکھ کر چونک گیا۔

”چھوٹے صاحب آپ کا فون ہے عائشہ بیٹا کا۔“

”اچھا آتا ہوں۔“ اس نے کسلمندی سے کتاب بند کردی۔ پھر تیز رفتاری سے فاصلہ طے کرکے فون تک پہنچا۔

”ہیلو یشل بول رہا ہوں‘ جی پاپا نہیں ہیں اچھا کہیے میں سن رہا ہوں کیا یہ پاپا کا فیصلہ ہے لیکن مجھے تو اس کی اطلاع نہیں ملی‘ نہیں میرے خیال کو چھوڑیئے آپ کی مرضی کیا ہے‘ ٹھیک ہے آپ کو اعتراض نہیں تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں‘ جی ماں باپ واقعی اولاد کا ہمیشہ بھلا سوچتے ہیں‘ بہت شکریہ آپ کا جی بہتر پاپا جی کو آپ کے فون سے مطلع کردوں گا۔

اچھا خدا حافظ۔“

اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا لیکن اطلاع ایسی تھی کہ اس میں دوبارہ لائبریری جانے کی خواہش نہ بیدار ہوئی پاپا تو اپنی اولاد کو معمولی سی معمولی بات بتانا اہم سمجھتے تھے لیکن یہاں کتنا غیر متوقع عمل کیا تھا پاپا نے یعنی اسے اس کی شادی کی طے پا جانے والی تاریخ بھی ہونے والی منگیتر دے رہی تھی وہ لڑکی ہو کر آگاہ تھی اور وہ اہم خبر سے بے خبر رکھا گیا تھا آخر ایسا کیوں کیا گیا تھا۔

اس کے چکراتے دماغ نے کتنی ہی بار سوچا مگر جواب نہ ملا وجہ سمجھ میں نہ آئی تو تھک کر اس نے دماغ کو آزاد کردیا اسے پاپا کا انتظار تھا اس لئے اس نے میوزک کے شور میں اپنے دماغ کے سوالوں کو مدغم کردیا۔

رات آٹھ بجے پاپا لوٹے تو جمال بابا نے رات کا کھانا لگانے کی اطلاع دی۔ وہ بمشکل یہ وقت گزار سکا کھانے سے فارغ ہو کر پاپا تو ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور اس نے اتنی دیر سے لبوں پر مچلتا ہوا سوال بلا آخر دوہرا ہی دیا پاپا نے سن کر آہستگی سے جواب دیا۔

”اچھا عاشی کا فون تھا‘ بڑی پیاری بچی ہے یہ عاشی‘ یشل تم یقین نہیں کرو گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرے مولا نے دونوں بہو میں بالکل بیٹیوں جیسی دی ہیں تم ملو گے اس سے تو تم بھی میری پسند کی داد دو گے۔“

”لیکن پاپا میں نے عائشہ کی شان میں قصیدہ نہیں سننا تھا میں تو پوچھ رہا ہوں آپ نے اتنی قریبی تاریخ دے دی نکاح کی اور وہ بھی مجھ سے پوچھے بنا۔“

”کیا مطلب تمہیں اس بات پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے کہ میں تمہارا نکاح چھ ماہ بعد کراتا ہوں یا چھ سال کے طویل عرصہ میں شادی تو تمہیں کرنی ہی ہے ناں اس لئے میں نے سوچا کہ موعود کا جس دن ولیمہ ہوگا اس دن تمہاری شادی بھی کردی جائے۔“

”ٹھیک ہے آپ کا یہ پروگرام مان بھی لیا جائے تو یہ سب بکھیڑا آپ موعود بھائی کی شادی کے ساتھ بھی انجام دے سکتے تھے یہ اچانک کیا سوجھی آپ کو۔“

”اچانک تو خیر نہیں سوجھی ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ جس طرح کا تمہارا لاابالی رویہ تھا وہ مجھے شادی کے اس فیصلے میں الجھن میں مبتلا کر رہا تھا لیکن موعود کی شادی کے بعد سے میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم میں بہت تبدیلی آئی ہے پہلے سے تم کچھ توجہ سے کام کرنے لگے ہو گو یہ تبدیلی کوئی اتنی بڑی اور میری منشا کے مطابق نہیں لیکن پھر بھی ایک امید بندھائی ہے کہ تمہاری شادی کردی جائے تو تم خود سدھر سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے کلیئر ہوگئی یہ بات‘ لیکن آپ یہ بتانا پسند کریں گے چھ مہینے بعد میری سالگرہ کے دن ہی شادی کیوں رکھی گئی ویسے میں تو اس بات پر بھی حیرت زدہ تھا کہ شادی کے چھ ماہ بعد ولیمہ کیا جائے۔“

”کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے‘ سوائے نئے پن کے ظاہر ہے ہم خود منفرد ہیں تو کیا برائی ہے جو ہم نے یہ سوچا شادی کے دوسرے دن تو ولیمہ سب کر لیتے ہیں بات تو تب ہے کہ ماہ عسل کے بعد ولیمہ رکھا

جائے' رہی یہ بات کہ عین تمہاری سالگرہ کے دن شادی کی ڈیٹ کیوں فکس کی گئی تو بیٹا جانو یہ بھی ہمارے دماغ کا کمال سمجھو دس اگست تمہارا برتھ ڈے ہے اس دن تمہاری زندگی کا اتنا اہم سفر شروع کروا دیا جائے تو یہ عام بات تو نہ ہوگی ناں اس طرح یہ دن نا صرف خوبصورت محسوس ہوگا بلکہ مستقبل میں تم اسے جب بھی یاد کرنے بیٹھو گے تو مسکراؤ گے اپنے پاپا کی ذہانت کو داد دو گے اور سچ پوچھو تو یہ سارا کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ تم ہمارے جانے کے بعد بھی ہمیں یاد رکھو۔"

"پاپا پلیز یوں تو نہ کہیں۔" وہ ہر اعتراض بالائے طاق رکھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا پھر ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لئے۔

"آپ جان ہی نہیں سکتے پاپا کہ آپ میرے لئے کتنے ضروری ہیں شاید یہ بات میں خود بھی سرعت سے نہیں جانتا لیکن یقین کریں اگر آپ نے میری زندگی سے نکلنے کی کوشش کی ناں تو میں دنیا تیاگ دوں گا بائی گاڈ آپ کے بغیر جینا ایسا ہی ہے جیسے بنا روح کے جسم۔"

پاپا کی آنکھوں میں محبت کے اس اعتراف پر آنسو جھلملانے لگے لیکن ان آنسوؤں میں شکستگی نہیں زندگی کی روشنی تھی اور ریشل ذکی کی زندگی اس روشنی ہی سے تو عبارت تھی سو اس نے پاپا کے فیصلے کو بغیر کسی حجت کے مان لیا۔"

زندگی اسی لگے بندھے انداز میں گزر رہی تھی۔ رمشا حسین ایک بار پھر افسانے سمیت اس سے ملنے آ گئی اس نے دیکھا تو بولا۔

"یقین کیجئے مس رمشا اس دن کے بعد مجھے یقین ہو چلا تھا کہ شاید اب آپ دوبارہ کبھی ہمارے پرچے کے لئے معاونت نہ کریں گی لیکن آپ نے تو واقعی اسپورٹ مین اسپرٹ کی مثال قائم کر دی لائیے اس بار کیا لکھا آپ نے۔"

اس نے خود سے ہاتھ آگے بڑھا دیا رمشا حسین نے نیا مسودہ سامنے رکھ دیا اس نے پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

"اس نے بستر پر دو تین قلابازیاں کھائیں لیکن بھوک جمناسٹک میں اس سے کہیں زیادہ ماہر تھی اس لئے وہ بے حال ہوتا ہوا بدوقت اٹھا ماں سے کھانے کو کچھ مانگا تو اس نے بے ساختہ کچن کی صورتحال کم و کاست بیان کر دی لیکن اگر وہ یہ بات لفظوں کا سہارا لئے بغیر نہ بھی بتاتی تو وہ اتنا جہاندیدہ تو ہو ہی چکا تھا کہ باآسانی اس کی خاموشی کی زبان سمجھ لیتا یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی غربت پر احتجاج کئے بغیر اپنی سونفٹ کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔"

"سونفٹ کی چابی۔ مس رمشا سچ بتایئے یہ افسانہ لکھتے وقت آپ کیا سوچ رہی تھیں۔"

"صرف ایک بات کاش آپ کو میرا یہ افسانہ پسند آ جائے آپ نے پچھلے افسانے میں دولت کی تشہیر پر اعتراض کیا تھا ناں اس لئے میں نے جان کر اس بار ایک غریب ہیرو کو موضوع بنایا ہے۔"

"غریب ہیرو' سونفٹ کار کی چابی اور غربت' دیکھئے مس رمشا برا نہ منایئے تو میں آپ کو ایک نیک مشورہ دوں۔"

"جی شوق سے دیجئے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تو پھر آپ پہلی فرصت میں افسانہ نگاری کی بجائے اپنے کلینک پر توجہ دیجئے دیکھئے جو افسانہ نہیں لکھتے وہ زیادہ بہتر طور پر جیتے ہیں' اس فیلڈ میں رکھا ہی کیا ہے تپ دق اور کھانسی کے سوا۔"

"جی اس میں کچھ سمجھی نہیں' وضاحت کریں۔" اس کی حیرت بجا تھی۔

"وضاحت کس کی' تپ دق کی یا کالی کھانسی کی۔"

"دونوں کی سمجھ لیجئے۔" سنجیدگی کے ریکارڈ توڑتا لہجہ گونجا۔

"دراصل جو انسان سوچتے ہیں وہ ان افراد کے مقابلے میں زیادہ سینی ٹوریم کا رخ کرتے ہیں جو بالکل نہیں سوچتے آپ ہی بتایئے سوچنے میں آخر رکھا ہی کیا ہے زندگی کو انجوائے کیجئے آپ بھی خوش رہنے کی کوشش کیجئے۔"

"لیکن مسٹر ریشل میں اس فیلڈ میں بہت آگے تک جانے کا پلان بنائے بیٹھی ہوں یوں سمجھئے دو ہزار فٹ کی بلند وسعتوں میں ایک سی ون تھرٹی محو پرواز ہے اور

میں پیراشوٹ باندھے کودنے کو تیار کھڑی ہوں آپ ہی بتایئے اس صورت میں کیا' کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن کچھ نہ کرنے سے بہتر یہ نہیں کہ کچھ کر ہی لیا جائے دیکھئے جہاز سے کودنے سے پہلے اس بات کی تسلی تو کی جا سکتی ہے کہ آپ کے کاندھوں پر دھرا بوجھ پیراشوٹ ہی کا ہے آپ کے بستر بند کا نہیں یعنی آپ سمجھ رہی ہیں ناں میری بات۔"

"جی بہت اچھی طرح سے لیکن پلیز آپ مجھے کوئی معقول مشورہ تو دے سکتے ہیں ناں دیکھئے میں واقعی اس معاملے میں بہت حساس ہوں۔"

"ٹھیک ہے اگر یہی بات ہے تو کوشش کیجئے کہ آپ کسی ذاتی یا محلے والوں کے کسی دکھ میں مبتلا ہو جائیں یہ تو آپ جانتی ہیں ناں کہ انسان کا قلم صرف اس وقت دلوں پر اثر کرتا ہے جب اس قلم کو پکڑنے والا دکھ سے بھرا ہوا ہو یعنی اثر انگیز صرف اس وقت لکھا جا سکتا ہے جب لکھنے والا اپنی ظاہری سوچ اور ذات سے ہٹ کر سوچے۔" وہ کہہ کر چپ ہو گیا اور رمشا حسین بہت دیر اسے دیکھے گئی پھر سنبھل کر بولی۔

"مجھے حیرت ہے مسٹر ریشل لوگ آپ کے بارے میں کتنی غلط رائے قائم کرتے ہیں ورنہ آپ کے انداز اور گفتگو سے کہیں سے بھی تو یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ لاابالی ہیں اور اگر یہ خامی واقعی آپ میں ہے ذمہ داری کا بوجھ کندھے پر ڈالنے سے آپ ہی آپ دور ہو سکتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن آپ کو اس خامی کے دور ہونے یا نہ ہونے سے کیا لگاؤ ہے۔"

"کیوں مسٹر ریشل کیا میں آپ کے بارے میں اپنی معمولی سی رائے بھی نہیں دے سکتی شاید آپ کو یاد نہیں ایک دن آپ نے ہی تو کہا تھا رائٹر ایڈیٹر میں بھی دوستانہ ماحول میں بات ہونی چاہیے۔"

"ہوں یہ تو ہے' چلئے میں اپنے پہلے الفاظ واپس لیتا ہوں ویسے آپ یہ افسانہ چھوڑ جایئے میں نوک پلک سنوار کر اسے لگانے کی کوشش کروں گا۔" اس نے بھی خیرسگالی میں دریا دلی دکھائی مگر رمشا حسین نے افسانہ پھر بھی شولڈر بیگ میں ڈال لیا پھر دعا سلام کے بعد اٹھنے لگی تو بولی۔

"آپ اس بات پر یہ خیال مت کیجئے گا کہ میں آپ سے خفا ہو کر جا رہی ہوں دوستانہ تعلقات اب بھی ہمارے درمیان ہیں لیکن یہ طے رہا کہ اب میں اپنا دوسرا افسانہ اسی وقت لے کر آؤں گی جب واقعی میرا وجدان میری ظاہری ذات سے ہٹ کر اپنے حصار سے باہر نکل کر سوچنے کی صلاحیت حاصل کرے گا۔"

"ایکسیلنٹ یہی سوچ کامیابی کی ضامن ہے آپ بے فکر رہیے اور یقین کیجئے آپ کا پہلا افسانہ اپنے رسالے میں چھاپ کر مجھے دلی خوشی ہوگی لیکن ایک منٹ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنا کانٹریکٹ نمبر لکھوا دیں تاکہ میں خود ہی آپ سے رابطہ کر سکوں۔"

"او شیور مسٹر ریشل کیوں نہیں' لکھیے۔" وہ اپنا فون نمبر بتانے لگی پھر مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی مگر ریشل ذکی کو لگا کہ وہ باہر جانے کی بجائے مزید دل کی سیڑھیاں اترتی چلی گئی ہو پھر وہ اس ملاقات کے سرور میں گم تھا ضمیر نے اسے بری طرح لتاڑا۔

"ذکی ریشل بہت بری بات ہے' امانت میں یوں خیانت نہیں کرتے تم مکمل طور پر اب عائشہ احمد کے نام ہو۔"

لیکن دل مچلنے لگا تاویلیں دے کر کہنے لگا۔

"عائشہ میری ذات کا حوالہ ہے اس سے مجھے انکار نہیں لیکن رمشا مجھے اچھی لگتی ہے میں اس سے بھی دوستی کرنا چاہتا ہوں۔" دماغ نے دل کی بات سنی تو پوچھا۔

"تمہیں اگر یہی بات عائشہ تم سے کہے تو کیا تم اس کو یہ چھوٹ دینے کے بارے میں سوچ سکتے ہو' نہیں ریشل ذکی تم اس طرح کی آزادی کے بارے میں صرف اپنی ذات تک ہی سوچ سکتے ہو سو تمہیں بھی خود پر یہ حد لگانی پڑے گی۔"

اس نے فیصلہ سن کر ہار مان لی اور رمشا حسین کا فون نمبر ڈس بن کی نظر کر دیا لیکن دوسرے دن رمشا حسین کا خود ہی فون چلا آیا تو وہ کنی کترانے کے باوجود کسی طور اس کی آواز کے سحر سے نہیں نکل سکا دونوں

میں ہونے والی باتوں کا موضوع موجودہ افسانہ ہی تھا۔

وہ سنجیدگی سے اسے افسانے کی پوری تاریخ بتا رہا تھا کہ اچانک اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

"پلیز یشل صاحب مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ اتنا طویل لیکچر ہضم کروں۔۔۔" لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی مگر جب بولا تو اس کا انداز پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"مس رمشا حسین ہماری نئی نسل کا دراصل المیہ یہ ہے کہ ہم بولتے رہنا چاہتے ہیں سننے کی سکت نہیں رکھتے جب کہ پہلے لوگ سنتے زیادہ تھے بولتے کم تھے آپ کبھی خاموش ہو کر دیکھیے اردگرد کی خاموشی آپ پر وہ لفظ بھی آشکار کرے گی جو کسی لغت میں نہیں اور جسے سمجھنے کے لیے تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری نہیں سوائے صاحب دل ہونے کے۔۔۔"

"یشل صاحب وضاحت کریں گے آپ۔۔۔"

"بہت لکھنا جس طرح بہترین لکھنے کی علامت نہیں اس طرح زیادہ بولنا بھی دانائی پر دلالت نہیں کرتا درمیانی راستے پر چلیے کامیاب رہیں گی صرف لکھنے کی بجائے پڑھنے پر بھی توجہ دیں۔۔۔"

"ہوں اب کلیر ہوئی یہ بات ٹھیک ہے اب میں پڑھنے پر زور دوں گی۔۔۔"

فون رکھ دیا گیا تو وہ دفتر کے کاموں کو سمیٹنے لگا لیکن یہ مواصلاتی تعلق روز بروز بڑھتا چلا گیا اس نے کتنی ہی کوشش کی اس منتر سے بچنے کی مگر وہ اس محبت کے دام میں گرفتار ہوئے بغیر نہ رہا رمشا حسین اس کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑنے لگی تھی۔

وہ بہت پریشان تھا اپنی ان کیفیات سے اس نئے تعلق کی ہر زنجیر توڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اس کی ایک بھی نہ چل رہی تھی اور یہی بدحواسی اس کے کیے جانے والے دفتری کاموں پر اثرانداز ہونے لگی جب ایڈیٹر صاحب نے سختی سے اس سے بازپرس کی تو وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے ہمتیں جمع کرتا رہا۔

اس کی کار کا رخ رمشا حسین کی کوٹھی کی طرف تھا گو فون نمبر اور پتا تو اس نے پھینک دیا تھا لیکن خود رمشا ہی تعلق کی خواہ تھی اس لیے اتنی بار اس نے اپنا فون نمبر اور گھر کا ایڈریس دوہرایا تھا کہ اسے زبانی یاد ہو گیا تھا۔

کار طوفانی رفتار سے محو سفر تھی لیکن کار کی رفتار سے کہیں زیادہ اس کے خیالات منتشر تھے آج اس نے عہد کیا تھا کہ وہ جاتے کے ساتھ ہی رمشا حسین سے اپنے خیالات شیئر کرے گا اسے بتا دے گا کہ وہ بظاہر جس کا بتایا گیا ہے اس کا نہیں رہا بلکہ اسے رمشا حسین نے چرا لیا ہے۔

اور یہ بھی کہ یہ رمشا حسین کی شخصیت کا ہی جادو تھا کہ وہ مختلف حصوں میں بٹ کر جس طرح زندگی گزارنے کو سب کچھ سمجھتا تھا اب ایک نقطہ پر مجتمع ہونا چاہتا ہے "جو ہو رہا ہے ہونے دو" کی بے حسی "کیا ہوا"؟ کے برف زاروں سے نکل کر وہ محبت کے ٹھنڈے میٹھے چشمے سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے۔

وہ اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ یشل زکی اب اپنی زندگی کو ایک ضابطے اور قانون کے تحت گزارنا چاہتا ہے مزید یہ کہ اگر وہ اس کا ساتھ دے تو وہ اس کے لیے دنیا سے بھی ٹکرا سکتا ہے۔۔۔"

اس کا سوچتا دماغ ابھی کسی اور خیال میں گم ہوتا کہ سنگ مرمر کی کوٹھی سامنے آموجود ہوئی وہ مزید سوچنا ملتوی کر کے کار پارک کرتا ایک ملازم کی معیت میں اندر داخل ہوا اگرچہ وہ یہاں پہلی بار آیا تھا مگر کسی ملازم نے اس کے اس طرح داخل ہونے پر اعتراض نہیں کیا تھا نہ مالکن کو خبر کرنے کی ضرورت سمجھی تھی سب اسے یوں دیکھ کر کام میں لگ گئے تھے جیسے یہ ان کے لیے قطعاً "غیر متوقع اور غیر معمولی نہ ہو لیکن یشل زکی کے لیے آنے والے لمحات بہت زیادہ غیر متوقع ثابت ہوئے تھے۔

وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں داخل ہونے والا تھا جب اس نے رمشا حسین کو کھلکھلاتے ہوئے فون پر کسی سے مخاطب سنا تذکرہ اس کا تھا اس لیے اس کے قدم وہیں تھم گئے وہ ادا سے کہہ رہی تھی۔

"ارے نہیں بھئی یہ سب تو صرف ایک پارٹ آف دا گیم تھا تمہیں میں اتنی بے وقوف لگتی ہوں کہ افسانہ لکھنے کی ابتدائی معلومات سے بھی نابلد ہوں۔

"ارے چھوڑو کیا بتاؤں وہ اسٹوپڈ مرے احمقانہ انداز پر کس طرح مرمٹا تھا پتا ہے وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ بہت عقلمند ہے اس لیے میرا ناصح بن گیا۔

نہیں صبا مجھے نفسیات کی ٹرک چلا کر کیا کرنا تھا لیکن یہ ہے کہ وہ اس طرح بہت پراعتماد ہو گیا ہے کنفیوژن اور بات واضح کرنے میں اس میں جو کم ہمتی تھی وہ دور ہو گئی۔۔۔ اچھا یہ بتاؤں کہ اسے میں نے کیوں لفٹ دی تو بس یار میں دراصل خود ساختہ ہجر میں مبتلا ہونا چاہتی تھی تمہیں تو پتا ہے نا صبا ہمارے ملک کے شاعر حضرات بھی اس طرح کسی نہ کسی سے محبت کرنے کا سوانگ کرتے ہیں مگر اس کا مقصد اس لڑکی سے شادی کی بجائے اپنے لفظوں میں تاثیر غم ہجر کا سوز لانا ہوتا ہے سو لکھنا تو مجھے آتا ہے لیکن شروع سے کوئی غم یا پرابلم نہیں دیکھی میں نے اس لیے میں نے سوچا کیوں نہ ایک جھوٹی محبت ہی کر لی جائے۔

ارے چھوڑو صبا وہ اس قابل کہاں کہ میں مذاق مذاق میں سنجیدہ ہو جاؤں کہاں وہ کہاں میں ایک مشہور معروف بزنس مین کی بیٹی۔۔۔"

وہ آگے بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر اس میں سننے کی تاب نہیں تھی تمام جذبے منجمد ہو کر رہ گئے تھے وہ تیزی سے واپس لوٹا پھر آندھی طوفان کی طرح گاڑی دوڑاتا گھر آیا تو بہت تھکا ہوا بے حال ہو رہا تھا اپنے وجود کا بوجھ پیروں پر سہارنے کی ہمت نہیں تھی سو بستر پر گر گیا بار بار اس کے جملے تیر کی طرح دل پر لگتے تو اس کی کراہ نکل جاتی

رات کو کھانے کی میز پر اسے بہت چپ دیکھ کر پاپا نے ہولے سے پکارا اور وہ ضدی اور غصے میں بھرے ہوئے بچے کی طرح بلک پڑا دل کا غبار نکال چکا تو پاپا کے سینے سے لگ کر رونے لگا۔

چار دن بعد دفتر گیا تو پہلے کے مقابلے میں ذمہ داری اور کچھ کرنے کا عزم اس میں موجود تھا۔ سب نے حیرت سے دیکھا ہاں البتہ پاپا کی آنکھوں میں اطمینان تھا یوں جیسے وہ اسے برسوں سے اسی روپ میں دیکھنے کے تمنائی تھے سو اس نے خود کو اس روپ میں ڈھال لیا تو پاپا کو یوں لگا جیسے ان کا بوجھ آدھا کم ہو گیا ہے

وقت پر لگا کر اڑتا ہی گیا پھر اس حادثے کے بعد تین ہفتے ہی گزرے ہوں گے کہ رمشا حسین کا فون آ گیا اس نے سختی سے بات کر کے فون رکھ دیا مگر رمشا بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی روز اس کے فون کی بیل بار بار بجتی رہتی اور وہ ریسور اٹھا کر نیچے رکھ دیتا۔ آج بھی یہ ہی ہوا جیسے ہی بیل ہوئی وہ پھٹ پڑا دل کھول کر اس کی کلاس لے لی۔ اس نے اب تک فون کرنے والے کی آواز نہیں سنی تھی۔ کچھ دیر بعد اپنی غلطی کا احساس کر کے خاموش ہوا تو ساکت رہ گیا "آپ کون بول رہی ہیں۔"

اپنے ہی لفظوں سے منہ کڑوا ہوا جا رہا تھا جب کہ مخاطب نہایت صبر و تحمل سے اس کی تلخ باتیں سن رہا تھا۔

"آپ کسی کی سنتے تو ہیں نہیں بس ڈانٹ دیتے ہیں میں رمشا نہیں عائشہ ہوں عائشہ احمد۔۔۔"

"اوہ عائشہ تم ہو۔۔۔" اس نے الجھ کر کہا وہ اس وقت عائشہ کے فون سے زیادہ اس بات سے الجھ گیا تھا کہ رمشا حسین کے متعلق وہ اس سے باقاعدہ جواب طلب بھی کر سکتی ہے اس نے اس کی ذات کے متعلق کیا کیا نہیں سوچ لیا ہوگا وہ کتنا عام سا ہو گیا تھا اس کے سامنے راہ چلتے فلرٹ کرنے والے نوجوانوں کی طرح اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے اس نے فوراً "پیش قدمی کی اور کہا۔

"دراصل رمشا نامی لڑکی مجھے تنگ ضرور کرتی ہے لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔"

"آپ کی پرسنالٹی سے بہت سے لوگ متاثر ہیں یہ میں بخوبی جانتی ہوں اس لیے آپ دل چھوٹا نہ کریں ان باتوں کو اہمیت نہ دیا کریں۔۔۔"

"تھینک یو عائشہ' تمہارا یہ اعتماد میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے" اس نے مطمئن ہو کر فون رکھ دیا اور سوچا عائشہ احمد کتنی اعلا ظرف ہے اس کی ایک غلطی جان کر بھی اس پر پردہ ڈال رہی ہے ایک وہ ہے اس کے ساتھ محبت میں فیئر نہ رہ سکا۔

لیکن پھر یہ خیال زیادہ دیر نہ رہ سکا اگلی بار عائشہ کا فون آیا تو وہ جھلا گیا بات ہی اس نے ایسی کی تھی

چھوٹتے ہی اس نے رمشا حسین کی خیریت پوچھی تھی ضبط تو اس نے بہت کیا مگر پھر بھی آواز بلند ہو گئی۔

”مجھے افسوس ہے عائشہ تم بھی عام لڑکیوں کی طرح طنز کرنے والی نکلیں“۔

”طنز کرنے والی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یشل دراصل یہ تو میں نے صرف اس لیے کہا تھا کہ رمشا حسین ایک طرح سے آپ کی محسن رہی ہے۔۔۔“

”رمشا حسین۔۔۔ اور میری محسن۔۔۔“

”تو اور کیا آپ خود ہی سوچیے اس کے فریب دینے سے پہلے کیا آپ سوچ سکتے تھے کہ آپ اپنا کام ذمہ داری سے کر سکتے ہیں انکل کو مطمئن کر سکتے تھے۔“

”بکومت عائشہ تم نہیں جانتیں تم میرے کن زخموں کو کرید رہی ہو۔۔۔“

”آپ کو ابھی تک زخم اور اعزاز میں فرق نہیں محسوس ہوا ارے جناب شہید عشق ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں یہ تو نصیب کے فیصلے۔۔۔“

”پلیز عائشہ مجھے کام کرنے دو مجھ میں تمہارے تلخ جملوں کا جواب دینے کی سکت نہیں۔“

”مجھے جواب حاصل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں تو آپ کو حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں کہ رمشا حسین نہ ہوتی تو آپ کبھی خود سے آگاہ نہ ہوتے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے میں ابھی تک خود سے بیگانہ تھا۔۔۔“

”یہ بات مجھ سے نہیں اپنے کولیگز اور افسران سے پوچھیے پھر فیصلہ کیجیے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

یشل ذکی نے واقعی سوچنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور غور کیا تو عائشہ احمد کی بات کو سو فیصد درست پایا واقعی رمشا حسین اگر اس کی زندگی میں یوں داخل ہو کر نہ نکلتی تو شاید وہ ساری زندگی یونہی بے مصرف گزار دیتا رمشا واقعی اس کے لیے خود آگاہی کا درس تو ثابت ہوئی تھی اس کا دیا گیا جذباتی دھچکا ہی تو تھا جس نے اسے نظم و ضبط کے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔

اس کا یہ غم ہی تو تھا جس نے اس کے اندر برسوں کے رکے ہوئے آنسوؤں کو ایک راستا دیا تھا یہ آنسو جو ممی کی ڈیتھ پر بہنے کے باوجود نہ بہا کر وہ ہمیشہ ایک محسوس بے حسی کا شکار رہا تھا رمشا حسین کے دھوکے کے بعد ٹوٹ کر دوبارہ سنبھل گیا تھا۔

واقعی یہ رمشا حسین کی ایک اچھائی ہی تھی کہ اس نے اسے خود سے ملنے کا موقع فراہم کیا تھا۔

اور پھر واقعی رمشا حسین کو اس نے شکریہ کا فون کر دیا رمشا حسین کی آواز قدرے مدھم تھی مگر اس نے بات کو طول دیے بغیر اپنی بات ختم کر کے فون رکھ دیا یہ کام ختم ہو گیا تو بہت ہلکا پھلکا ہو کر اس نے آنے والے دنوں کا انتظار شروع کر دیا۔

وقت مٹھی سے ریت کی طرح تیزی سے پھسلتا گیا یہاں تک کہ یکم اگست کو موعود بھائی اور انیقہ بھابھی گھر لوٹ آئے دونوں کے چہرے بہت زیادہ خوشی سے چمک رہے تھے حقیقی خوشی واقعی قسمت سے ملتی ہے لیکن اندر تک گلاب کھلا دیتی ہے۔

”ارے وہ ینگ مین کیسے ہو۔۔۔“ موعود بھائی نے بابا سے بغل گیر ہو کر اسے خود سے لپٹا لیا تو وہ ہولے سے ہنس دیا۔

بابا انیقہ بھابھی موعود بھائی اس کی کیفیت سے بے خبر دس اگست کو ایک شاندار پروگرام ترتیب دے رہے تھے آخر دس اگست کی صبح بھی طلوع ہو ہی گئی گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔

بابا نے شادی کی تقریب کا انتظام سبزہ زار میں کروایا تھا شام سات بجے کی تقریب تھی لیکن وہ سب گیارہ بجے ہی سے تیاریوں میں لگ گئے تھے اور وہ اس تقریب کی اہم شخصیت ہونے کے باوجود بھاری دل سے تیار ہوا بہت بے زاری سے اٹھ کر لان میں آ بیٹھا پھر ابھی کچھ سکون محسوس کیا تھا کہ ملازم فون لیے چلا آیا اس نے ریسیور تھاما۔

”جی یشل ذکی بول رہا ہوں آپ کون۔۔۔“

”میں رمشا حسین بول رہی ہوں دراصل میں نے سوچا جس طرح آپ نے اس دن اعلا ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا اسی طرح مجھے بھی آپ کو مبارک باد دینی چاہیے۔۔۔“

”تھینک یو“ اس نے مختصراً کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

وہ سب وقت مقررہ پر سبزہ زار پہنچے۔ موعود بھائی انیقہ بھابھی کے ساتھ خوشگوار موڈ میں بیٹھے تھے اس کے برابر میں عائشہ احمد تھی مووی کیمرہ اس کے چہرے پر بار بار فوکس ہو رہا تھا اس لیے اس کو مصنوعی مسکراہٹ سجانی پڑ رہی تھی کتنا ہی وقت بیت گیا

پھر نکاح خواں آ گئے اور اس نے اپنی دلی رضا مندی سے دستخط کر کے عائشہ احمد کو اپنا ہم سفر مقرر کر لیا رخصتی کروا کر وہ گیارہ بجے گھر لوٹ آئے لیکن چونکہ گھر میں بڑے ہال میں اس کے برتھ ڈے کا انتظام پہلے سے طے تھا اس لیے وہ تھکن کے باوجود اس پارٹی کو سلیبریٹ کرنے لگے سب کے چہروں سے محبت اور خوشی منعکس ہو رہی تھی۔ مگر یشل ذکی غیر مطمئن تھا اس نے اپنے دل کو ایمانداری سے عائشہ احمد کے نام کیا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ عائشہ احمد بھی خلوص دل سے اس کی منتظر ہے یا نہیں۔

وہ سر جھکائے صوفے پر بیٹھا تھا جب بالکل اچانک عائشہ یشل بڑے خوبصورت انداز میں کیک کو موم بتیوں سے سجائے ہال کے دروازے سے داخل ہوئی یشل ذکی تو اس کے حسن سے مبہوت ہو گیا عائشہ یشل نے راجھستانی شرارہ سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا نازک پیروں میں پازیبیں ہر ہر قدم کے ساتھ چھنک رہی تھیں کامدار دوپٹہ اسٹائل سے سنبھالا ہوا تھا بالوں کی لمبی سی چٹیا آگے پڑی تھی بلاشبہ وہ حسین لگ رہی تھی۔

”کیوں بھئی کیا خیال ہے ہماری بہو کے بارے میں۔۔۔“ بابا بالکل اس کے کان میں بولے وہ بولا تو کچھ نہیں لیکن آنکھوں کی ستائش اور محبت عائشہ یشل کے وجود پر ہی مرکوز تھی اس لیے بابا نے اس خوش کن ساعت کا توڑنا ضروری نہ سمجھا کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں چلے گئے۔

پھر اس نے تالیوں کے شور میں سالگرہ کا کیک کاٹا سب کے لبوں پر اس کے لیے دعائیں تھیں لیکن اسے صرف عائشہ یشل کی کھنکتی چوڑیوں کی اور خوشی سے گنگناتی آواز آ رہی تھی سوائے اپنے خوش قسمت ہونے کا لمحہ بھر میں یقین آ گیا یہ اور بات کہ وہ اس یقین دے بے پایاں مسرت کو اس سے شیئر کرنے کے لیے موقع ڈھونڈتا رہا پھر وہ اسے تنہا ملی تو اس نے پہلی فرصت میں اسے جا لیا۔

”رمشا حسین یہ سب کیا تھا۔۔۔“

”کون رمشا حسین آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں عائشہ یشل ہوں جناب۔۔۔“

”ٹھیک ہے مان لیا کہ تم عائشہ یشل ہو تو یہ کہو رمشا حسین کون تھی۔۔۔“

”میری جڑواں بہن سمجھ لیجیے۔۔۔“

”بکومت‘ تم نے یعنی اتنے عرصے تک مجھے بے وقوف بنائے رکھا آخر کیوں۔۔۔“

”خود سے پوچھیے کیوں؟ ویسے خاطر خواہ فرق دیکھ رہی ہوں۔۔۔“

یشل ذکی نے گھور کے اسے دیکھا پھر بولا ”عائشہ فرض کرو اگر میں تمہارے اس نفسیاتی علاج سے سنورنے کی بجائے اور شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا تو۔۔۔“

”تو میں یہ پروگرام کینسل کر کے اپنا آپ ظاہر کر دیتی مجھے یقین تھا خود پر کہ میں یہ مشکل کام سرانجام دے لوں گی ویسے آپ کو خود آگاہی بہت بہت مبارک ہو۔۔۔“

”مبارک باد مجھے نہیں بابا کو دو جا کر‘ مجھ سے کہیں زیادہ وہ مجھے انسان کی جون میں دیکھنا چاہتے تھے۔“

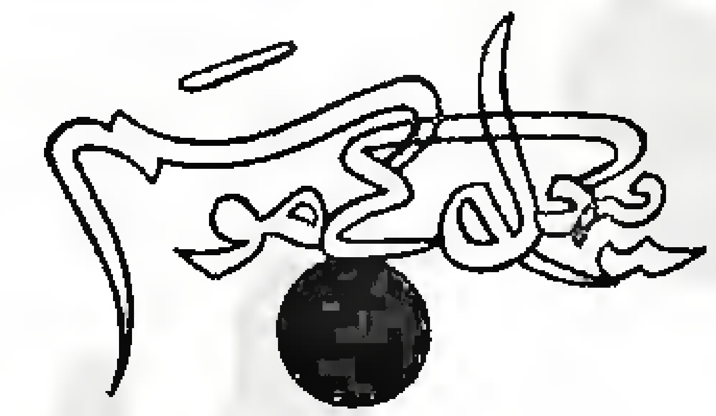
عائشہ کچھ نہ بولی صرف ہنس پڑی اور یشل ذکی نے اس کے شفق رنگ چہرے کو دیکھا تو آہستگی سے بولا۔

”سچ پوچھو تو یہ دس اگست واقعی میرا جنم دن ثابت ہوا‘ عائشہ یشل اس دن کی طرح میں ہمیشہ تمہیں دل سے لگا کر رکھوں گا تم اور تمہارا یقین سو فیصد سچا ثابت ہوا‘ بائی گاڈ عاشی تم نے میرے مزاج ہی کو نہیں میرے دل کو بھی مفتوح بنا لیا ہے اور یہ چھوٹی موٹی کامیابی تو نہیں۔۔۔“

عائشہ یشل نے شرما کر سر جھکا لیا تو اس نے اطمینان سے آنے والے خوبصورت دنوں کو ابھی سے سلیبریٹ کرنا شروع کر دیا کہ یہی زندگی اور زندہ دلی کا تقاضا تھا۔۔۔

--*

اس وقت وہ لنچ کے لیے ہوٹل شاما میں آئی تھی مگر بالکل غیر متوقع اس کی نظر عارف صہبائی پر جا پڑی تو اسے حیرت کے ساتھ ہی ساتھ خوشی بھی محسوس ہوئی اور وہ اپنی مخصوص میز کی طرف بڑھنے کے بجائے عارف صہبائی کی طرف قدم اٹھاتی چلی گئی۔ عارف صہبائی سینتیس برس کے ایک خوبرو اور اسمارٹ سے خوش پوش و خوش اخلاق شخص تھے اور اسے یقین تھا۔ وہ دور جوانی میں بہت زیادہ ہی مہ جبینوں و نازنین دلوں کی دھڑکن رہے ہوں گے۔ اس سے ان کی جان پہچان ان کے انٹرویو کی غرض سے ہوئی تھی۔ ان دنوں اس نے نیا نیا ”ایکشن میگزین“ جوائن کیا تھا۔ کچھ اس کا موڈ شروع سے چیلنج پسند تھا پھر کچھ عارف صہبائی کی تحریروں کا ایسا چارم تھا کہ وہ خوشی خوشی اس میگزین میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کے شامل ہوگئی۔



سعدیہ عزیز آفریدی

عارف صہبائی کا موضوع معاشرتی اصلاح سے بھرپور کہانیاں ہوتی تھیں جس میں قانون کی بالادستی کو ہمیشہ اولیت حاصل تھی اور یہی ان کے قلم کی سحر کاری تھی۔ قارئین ان کے قلم کے جادو میں اس بری طرح جکڑے ہوئے تھے کہ پرزور مطالبہ کرنے لگے کہ ایکشن میگزین کا کوئی شمارہ صرف عارف صہبائی کی تحریروں اور انٹرویو سے مزین کرکے ترتیب دیا جائے۔ یہ بات مدیر اعلیٰ کے سامنے پیش ہوئی تو سب نے اس مطالبہ کی حمایت کی اور مدیر اعلیٰ سید نور عالم نے دو ٹوک انداز میں فیصلہ دے دیا کہ ”رائٹر ہو یا فلم ٹی وی ریڈیو کا کوئی آرٹسٹ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے مرنے کے بعد انہیں پوج کر مردہ پرستی کا اظہار کریں۔ سو یہ روش بدلنے کے لیے قدم ہم اٹھاتے ہیں۔ مسٹر عارف صہبائی اس مقام پر ہیں کہ واقعی ان کے لیے کچھ کرکے ہم سب اپنے اپنے مقام اور اختیار کا حق ادا کرسکتے ہیں۔“

یوں عارف صہبائی کی پندرہ سال پیشتر کی تحریروں میں سے بہترین تحریریں چن کر ایک گلدستہ بنایا گیا اور اس گلدستے کی خوشبو کو زیادہ مہکیلا کرنے کے لیے ان کا ایک بالتفصیل باتصویر انٹرویو کرنے کا پلان بنایا گیا

اور یہ قرعہ فال جوہی نوید کے نام نکلا۔ بقول زینب راشد کے ”جوہی میں ایک بہترین سرجن چھپا ہے۔ یہ بات میں سے بات نکالنے اور اس میں سے اپنے مطلب کی بات چن لینے میں ماہر ہے کسی ماہر سرجن کی طرح اس کی زبان چلتی ہے۔ رکتی ہے اور باتوں سے لفظوں کا آپریشن کرتی تیز بین نگاہ سے ناسور الگ اور باقی ماندہ زخم پر تسلی ڈھارس کے ٹانکے لگا جاتی ہے کہ بین السطور سوچنے کا سامان رہے۔

یوں جوہی نوید پہلی بار عارف صہبائی کے گھر گئی خوب ڈھیر ساری باتوں کے درمیان اس پر جو کھلا یہی راز تھا کہ عارف صاحب نہ صرف اپنی تحریروں میں خوبصورت دکھتے تھے بلکہ درحقیقت وہ اصل زندگی میں لفظوں سے بھی زیادہ پرکشش شخصیت رکھتے تھے۔ ان کے ہر لفظ سے محبت کی مہکار اٹھتی تھی۔ اپنی بیوی کے لیے انہیں لفظ نہ ملتے تھے کہ

اپنی محبت کی تشریح کر سکتے۔ ان کی بیگم کی شخصیت درحقیقت ان ہی کی شخصیت کا عکس تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسے اس بات پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ جب اس نے ان کی فیملی کے ساتھ ان کی تصویریں کھینچنے کی استدعا کی تو وہ جز بز ہو گئے مگر بہت جلد سنبھالا لے کر بولے۔

"دراصل بیگم ایک فیملی گیدرنگ میں شریک ہونے کے باعث اس خواہش کی تکمیل کرنے سے مجبور ہیں۔"

لہجہ اتنا پُروقار اور مضبوط تھا کہ اس نے ان کی ہی مختلف زاویوں سے چند تصویریں اتار کر انٹرویو کمپوزنگ کے لیے دے دیا اور قارئین نے پورا پرچہ ہی بے حد سرپرائزنگ کیفیت میں پڑھا اور اسے ایک نادر تحفہ تسلیم کیا۔ یوں زندگی اسی رفتار اور موڈ سے چلتی رہی لیکن جوہی نوید کے دل میں عارف صہبائی کی شخصیت کا بہت گہرا عکس بیٹھ گیا۔ اسے باوفا' پرمحبت مردِ سدا سے تکریم کے قابل لگتے' خود اس کے والد' بھائیوں میں یہی عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس لئے عارف صہبائی کو وہ اسی قطار میں کھڑا رکھ کر پوری عزت و تکریم سے پیش آتی ان کا فون جب بھی آتا تو ہر کام روک کر ان کی بات توجہ سے سنتی۔ کوئی توجہ طلب بات ہوتی تو فوراً" اس کے سدباب کے لئے تجویزیں پیش کرنے لگتی۔ یعنی بہت اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ دونوں کے درمیان' سو اس وقت عارف صہبائی کو دیکھ کر اس کے ذہن پر خوشگوار تاثر پیدا ہوا تھا۔ دفتر سے اٹھتے وقت قطعاً" اسے اپنے اردگرد کوئی قابل توجہ بات نظر نہیں آرہی تھی' لیکن اس وقت تو چاروں اطراف میں منظر ہی منظر بکھرے ہوئے تھے۔ قابل توجہ اور قابل ستائش اور ان منظروں میں دل بنے دھڑک رہے تھے عارف صہبائی۔ سو وہ ان کی میز کے قریب جا کر اس طرح کھڑی ہو گئی کہ پہلی ساعت ہی اس پر نظر پڑتی لیکن عارف صہبائی اس وقت کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ اس کی آمد اور اس کے کھڑے ہونے پر قطعاً" متوجہ نہیں ہوئے یہاں تک کہ اسے ڈھیٹ بن کر انہیں خود اپنی طرف متوجہ کرنا پڑا۔

"ہیلو مسٹر عارف! کیسے ہیں آپ...."

عارف صہبائی نے چونک کر سر اٹھایا۔ جوہی نوید کو سامنے پایا تو مسکرا کر بولے۔

"ارے مس جوہی! آپ! آیئے ناں کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھ جایئے پلیز...." اسے بیٹھنے کی آفر کے ساتھ ہی انہوں نے ویٹر سے اپنے لئے کافی اور اس کے لئے اسٹیم روسٹ کا آرڈر دے دیا۔ وہ ناں ناں کرتی رہ گئی مگر عارف صہبائی نے ایک نہ سنی۔ سو اس نے اعصاب ڈھیلے ڈال کر ان سے آئندہ ماہ کی تحریر پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے لفظوں کو مجتمع کیا۔ انہوں نے چونکا انداز دیکھا تو مسکرا کر بولے۔

"مس جوہی! لگتا ہے اس وقت بھی آپ کیل کانٹے سے لیس ہو کر پوری تیاری میں ہیں۔ بائی گاڈ! آپ کا جو انداز ہے ناں اسے دیکھ کر مجھے کسی جنگل کا سماں یاد آجاتا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں بنگال ٹائیگر کے شکار کرنے سے پہلے کی تمام تر موومنٹ ایک کے بعد ایک کر کے در آتی ہیں۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ بنگال ٹائیگر انسان کو مارتا ہے جبکہ آپ انسانیت کو ممکنہ قتل ہونے کے خدشے دھوکے سے بچانے کے لئے اپنی توانائیاں خرچتی ہیں اور یہ بات' یہ پوائنٹ ایسا ہے کہ آپ کو طاقت کے ایک الگ وکٹری اسٹینڈ پر لے جاتا ہے' ممتاز کر دیتا ہے اس سے...."

"ارے مسٹر! آپ تو مبالغہ آرائی کر گئے۔ میری تعریف میں۔ کہاں میں کہاں...."

"مس جوہی! میں رائٹر اور شاعر ضرور ہوں' لیکن آپ نے دیکھا ہو گا۔ بہت کم مبالغہ آرائی کرتا ہوں۔ میری پہلی ترجیح سچ کو پورٹرے کرنا۔ حقیقت کو پہنچانا ہے تاکہ لوگ خوابوں کے مسمریزم میں ہی گم نہ رہیں' اپنے اچھے برے کا خود موازنہ کر کے فیصلہ کر سکیں۔ سو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کام میں اپنی معاون کی تعریف میں۔ میں مبالغہ آرائی کر جاؤں...."

"اچھا تو یوں کہئے۔ آپ رائٹر اور ایڈیٹر کے نازک تعلق سے ہراساں ہیں...."

عارف صہبائی نے قہقہہ لگایا اور جوہی کو ماننا پڑا۔ ان کے قہقہے میں بھی ایک الگ گونج اور متوجہ کر لینے کی پوری صلاحیت ہے۔ انہوں نے جیب دیکھا تو میز پر جھک آئے پھر شرارت سے بولے۔

"مس جوہی! آپ نے تو سچ پوچھئے۔ میرے دل کی بات کہہ دی واقعی ایڈیٹر رائٹر کا رشتہ اتنا نازک ہے کہ دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔ یہ ایڈیٹر ہی کی تو مہارت کی بات ہے' وہ رائٹر کی کس بات کو کس طرح پروموٹ کرتا ہے۔ کرتا بھی ہے یا اصل پیغام کا گلا گھونٹ کر تحریر کو بے رنگ' بے مقصد کر دیتا ہے۔ بائی گاڈ! پروف ریڈر سے زیادہ خطرناک ہے ایڈیٹر۔"

جوہی کو بھی ہنسی آگئی۔ مسٹر عارف نے توجہ سے دیکھا پھر بولے۔

"مس جوہی آپ ہنستی رہا کریں۔ شاید آپ کو کسی نے بتایا نہیں کہ آپ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں...."

جوہی نے سر اٹھا کر دیکھا مگر لہجے کے برخلاف ان کی آنکھوں اور چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا' سوائے توجہ اور تقدس کے۔ اسے اکثر مردوں کی نگاہوں میں ایک خاص طرح کی بے باکی اور فتح کر لینے کی حکومت کرنے کی پرغرورانہ چمک دکھائی دی تھی۔ مگر عارف صہبائی کی طرف وہ جب بھی دیکھتی ان کی آنکھوں میں نا اس طرح کی اطمینان بخش ڈھارس بھری توجہ پھوٹتی رہتی۔ ایک خاص طرح کا احساس تحفظ دیتی ہوئی۔ یہی وجہ تھی اس نے عارف صہبائی سے کبھی بطور ایڈیٹر کے بات چیت نہ کی۔ وہ قاری اور فین کے درمیانی تعلق سے ایک مرکزی تعلق بنا کر ان سے مخاطب ہوئی اور کبھی مایوس بھی نہ ہوئی۔ سو اس نے توقف کے بعد پوچھا۔

"مسٹر عارف! آپ کا ناول کس درجے تک پہنچا اس بار ایکس پائری تاریخ تو ہو چکی ہے جبکہ آپ ہمیں ہمیشہ اس تک اپنی تحریر سے نواز دیتے ہیں...."

"یقیناً" مس جوہی! اس سے انکار نہیں لیکن اس بار پرابلمز ایسے آگئے ہیں۔ میرے لکھنے کی رفتار میں بہت فرق پڑا ہے' دراصل اس بار میں جو کہانی لکھ رہا ہوں۔ اسے آپ آپ بیتی سمجھ سکتی ہیں۔ جسے میں اس کے راوی سے سننے کے بعد اپنے اسٹائل میں ضبط تحریر میں لا رہا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن مسٹر عارف! آپ قارئین کے جذبات اپنے بارے میں تو جانتے ہی ہیں ناں۔ ایکشن میگزین ہماری کاوشوں کے بعد آپ کی تحریر سے سجتا ہے۔ آپ کی تحریر ہمیں ہر صورت ملنی چاہئے کیونکہ کبھی آپ کی تحریر میں تعطل پیدا نہیں ہوا...."

"یہ تو ہے' شروع سے میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے۔ پڑھنے والے جس طرح چاہتے ہیں' جو چاہتے ہیں اس پر قلم اٹھاؤں اور بنا کسی گیپ کے ان سے تعلق قائم رکھوں' لیکن اس بار کہانی کچھ اٹک ہی گئی ہے۔"

"لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے' یہ ایک سچی کہانی ہے جس کا راوی کوئی اور ہے...."

"جی ہاں یہی تو اصل مسئلہ ہے اگر میں چاہوں تو تخیلاتی طور پر اس کہانی کو کوئی نہ کوئی موڑ دے کر اس کا اختتام کر سکتا ہوں مگر اس طرح اس کا اصل اور ندرت خیال متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ دوسری طرف کہانی کا راوی اچانک ہی مجھ سے گم ہو گیا ہے...."

"راوی گم ہو گیا ہے۔ میں سمجھی نہیں کچھ؟...."

جوہی نے تحیر سے دیکھا تو عارف صہبائی ہنس پڑے پھر بولے۔

"کیوں مس جوہی! یہ شہر تو اتنا بڑا ہے کہ کتنے ہی جیون آئے گم ہوئے پھر آئے اور کھو گئے۔ یہ کوئی تحیر خیز بات تو نہیں کہ میرا راوی بھی گم ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اس کو کوئی ذاتی پرابلم آ پڑی ہو۔۔۔"

"پھر مسٹر عارف! اس کا کیا حل ہو سکتا ہے۔۔۔"

"یہی تو اتنی دیر سے میں سوچ رہا ہوں۔ دیکھتے ایک آدھ دن انتظار مزید کر دیکھتے ہیں پھر کوئی دوسری صورت نکالتے ہیں۔۔۔"

"مگر مسٹر عارف! اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔ آپ یوں کیوں نہیں کرتے کہ اس تحریر کو مجھ سے ڈس کس کر لیں۔ تاکہ کہانی کو کوئی نیا موڑ دیا جا سکے۔۔۔"

"کہانی نیا موڑ تو خود ساتھ لاتی ہے۔ جس طرح ہر تصویر اپنا موضوع اور رنگ ساتھ لاتی ہے لیکن خیر یہ تجویز اتنی بری بھی نہیں۔ آپ بتائیے کیا آپ فارغ ہیں۔۔۔؟"

جوہی نوید نے خاموشی سے ان کو دیکھا۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اس کی بات مان لیں گے کیونکہ بہرحال وہ ضدی اور تخلیق کار کی طرح اپنے کام کے معاملے میں بہت حساس اور سنکی سے بھی تھے۔ لیکن جب انہوں نے اس کا اعتراض حرف غلط کی طرح مٹا دیا تو اس نے جلدی جلدی اپنے ذہن میں اپنی مصروفیات کی کیلکولیشن کر کے فارغ وقت پیدا کرنے کی کوشش کی پھر مسکرا کر بولی۔

"آپ کب اس کہانی پر کام کرنا چاہتے ہیں۔۔۔؟"

"ابھی اور اسی وقت لیکن کیا آپ ابھی فارغ ہوں گی۔۔۔"

"ارے کیوں نہیں سر! ابھی ایک بجا ہے۔ شام تک کے لئے میں فری ہوں۔ فرمائیے آپ کا کیا پروگرام ہے۔ آپ دفتر میں چلئے گا یا گھر پر کام کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔۔۔"

"دراصل گھر کے ماحول میں کافی پرسکون خیال کرتا ہوں میں خود کو اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔۔۔"

"ارے نہیں سر! بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بلکہ یہ تو میری خوش قسمتی ہو گی چلئے۔۔۔"

اس نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کر کے تجویز قبول کر لی تو عارف صہبائی بل پے کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور جوہی نوید نے دفتر کے اپنے کولیگ شامی فاروقی کو اپنی آئندہ کی مصروفیات سے آگاہ کیا۔ پتا نہیں اس نے یہ کیوں ضروری خیال کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض کاموں کی کوئی وجہ نہ ہو تب بھی وہ ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ سو وہ عارف صہبائی کی کار میں بیٹھ کر ان کے شاندار بنگلے پر جا پہنچی۔

عارف اسے سیدھا اپنی اسٹڈی روم میں لے گئے اور جوہی نوید کو عجیب سا لگا کہ گھر میں ہو حق کی سی کیفیت کا ڈیرا تھا جبکہ وہ اپنے بچوں کی شرارتوں اور شور و شغب کے قصے ہمیشہ مزے لے لے کر سناتے اور خاص کر اپنی بیگم صاحبہ کا ذکر اتنی محبت توجہ سے کرتے کہ اسے مسز عارف کی قسمت پر رشک آنے لگتا لیکن یہاں تو اس نے کچھ سوچ کر بڑی سی میز کے گرد بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے سوال کر لینا ضروری سمجھا۔

"مسٹر عارف! بیگم صاحبہ اور بچے دکھائی نہیں دے رہے۔۔۔"

عارف صہبائی صاحب نے ہنس کر الماری کھول کر مسودہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ سگریٹ جلا کر گہرا کش لیتے ہوئے وہ اس کے سامنے ہی میز پر ٹک گئے اور مطمئن لہجے میں بولے۔

"مس جوہی! دراصل گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے میری بیگم اپنے میکے یعنی برطانیہ چلی جاتی ہیں۔ اس لئے ان سے ملاقات نہیں کروا سکوں گا۔ ویسے جو کام ہم یہاں کرنے آئے ہیں۔ اس کے لئے خاموشی اور تنہائی کی بہت اشد ضرورت ہے۔"

"جی یہ تو ہے لیکن پھر بھی بیگم صاحبہ کی موجودگی میں گھر اور زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا۔"

"خوبصورت یا محفوظ؟ سچ بتائیے مس جوہی آپ خود کو اس گھر میں غیر محفوظ محسوس کر رہی ہیں۔" جوہی نوید نے بے بسی سے اپنے کیو ٹکس

[illegible] ان کو دیکھا اور سوچا وہ ایک بہت بڑی ضرورت ہیں [illegible] کے ادارے کی۔ اس لئے برملا اظہار کر کے [illegible] اور بدمزگی مول لینے سے بہتر ہے۔ جلد سے جلد [illegible] بات کر لی جائے سو خود کو قابو کر کے بولی۔

"آپ نے یہ اندازہ کیونکر لگایا سر! کہ میں خود کو غیر محفوظ محسوس کروں گی' وہ بھی آپ کی موجودگی میں۔۔۔"

"کیا واقعی آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں مس جوہی کہ لوگ میری قربت میں احساس تحفظ محسوس کریں۔"

"سر! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ تو سر سے لے کر پیر تک خوبیوں کا مرقع ہیں بھلا آپ سے [illegible] شکایت ہو سکتی ہے۔"

"ارے واہ! آپ نے تو بنانا ہی شروع کر دیا۔۔۔" [illegible] کی کوشش کی لیکن درمیان ہی سے سنجیدہ ہو کر [illegible] لے۔

"مس جوہی! پورے پندرہ برس سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن میں آپ کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ آپ جوہی نوید ہیں۔ آپ کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ کبھی ہمارے درمیان ایسی باتیں نہیں ہوئیں حالانکہ ایڈیٹر' رائٹر کی حیثیت سے ہمارے درمیان بہت حساس رشتہ قائم ہے۔"

"آپ نے بجا فرمایا مگر سر! قارئین کو تحریروں سے [illegible] ہوتی ہے' ایڈیٹر کی ذات کیا ہے۔ وہ کون ہے۔ اس نے کن حالات میں شعبہ جوائن کیا۔ اسے اس سے کیا غرض؟ یہی وجہ ہے کہ آپ نے بھی میرے متعلق کچھ نہ پڑھا' رہا حساس تعلق تو مجھے اس سے انکار نہیں لیکن بہرحال ذاتی زندگی تو ایک پرسنل افیئر والی بات ہوتی ہے اس سے کسی رائٹر کو کیا دلچسپی۔۔۔"

"کسی رائٹر کی دلچسپی کو چھوڑیئے۔ میری بات کیجئے مجھے تو آپ کی ذاتی زندگی جاننے کا بہت شوق ہے۔۔۔"

"مگر سر! ہم یہاں ذاتی زندگی نہیں کہانی ڈس کس کرنے آئے ہیں بتائیے کہاں آ کر کہانی رک گئی تھی۔۔۔"

"یہی چند قدم پر شاید تمہاری آنکھوں کے موڑ پر۔ جوہی پلیز بتاؤ نا تمہاری حقیقی زندگی کیا ہے کیا تھی۔۔۔؟"

"سوری سر! بات کسی طرح ہماری پالیسی سے میچ نہیں کرتی اگر آپ اس وقت خالی الذھن ہو رہے ہیں تو یہاں سے چلنا چاہوں گی۔۔۔"

"لیکن اگر میں تمہیں جانے نہ دوں۔۔۔"

"کیا مطلب سر آپ۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں۔۔۔؟"

"یقیناً" لیکن میں آج تمہاری کہانی سے اس کہانی کو موڑ دینا چاہتا ہوں۔۔۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سر! میری کہانی سے آپ کی اس کہانی کو کیا موڑ مل سکتا ہے بھلا اس سے میرا کیا تعلق ہے۔۔۔"

"تعلق ہے تمہارا ہی تو تعلق ہے۔ پلیز تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو جوہی!"

"سر! آپ واقعی اس وقت اپنی بات سمجھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں' بے ربطی آپ کے افعال و اعمال سے ہی نہیں' لہجے سے بھی جھلک رہی ہے۔۔۔"

"شکر خدا کا۔ تم نے میری بے ربطی محسوس تو کی ورنہ لوگ تو میرے ہر جملے ہر بات میں جانے کس کس کا انداز سخن تلاش کر کے مجھے داد دیتے ہیں۔ لیکن کل ہی میں نے پڑھی تھی اک نظم فرض کرو اگر تمہیں ایک سال ہو جائے مرے ہوئے تو۔" جوہی بائی گاڈ! اس نظم نے میری بے ربطی کو بہت واضح کر دیا۔ جوہی! کیا واقعی لوگ ہماری تحریروں میں اپنے دکھ دیکھ کر ہماری تحریروں سے خط اٹھاتے ہیں' وہ پسند کرتے ہیں ہمیں صرف اس لئے کہ ہم جو کہتے ہیں' وہ ان کے دل کی بات ہے ان کی بات ہے۔ ہماری اپنی باتیں کون سنے گا۔ جوہی! جو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ جس کے لئے کہنا چاہتے ہیں' لوگ وہ کیوں نہیں محسوس کرتے۔۔۔"

"سر! مجھے آپ کافی ڈیپریس لگتے ہیں ورنہ یہ تو سامنے کی بات ہے بات اپنی ہو یا کسی اور کے دل کی' تحریر کرنے کا ہنر تو ہمارا ہے ناں۔ اس لئے اگر کوئی تحریر یا کسی کا کردار ہٹ لسٹ پر آتا ہے تو یہ درحقیقت

اسی رائٹر کی محنت شاقہ کو خراج تحسین ہے۔ لوگ آپ کی باتیں پڑھ کر اگر اس تناظر میں دیکھتے ہیں کہ یہ شخص ہمارے دل کی باتیں لکھ رہا ہے تو یہ تو آپ کے لفظوں کی حرمت ہے۔ ان کی پاکیزگی' سچائی کا طرہ امتیاز ہے ناں کہ دل سے نکلی' دل میں جا گزیں ہوگئی۔ یہ ایسا رابطہ ہے سر! کہ جس کی خوشنمائی اور اہمیت پر صفحے کے صفحے سیاہ کئے جاسکتے ہیں۔۔۔"

"یقیناً" مس جوہی! آپ کا تجزیہ درست ہے' لیکن کبھی کبھی ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم صرف اپنا دکھ لکھیں۔ شام الم کے قصیدے چھیڑیں۔ بین کریں اور سب لوگ ہمیں ساکت دم سادھے دیکھتے چلے جائیں اور کہیں یہ کہانی واقعی ان میں سے کسی کی نہیں' یہ بیتی کسی اور ہی پر بیتی ہے اور وہ رائٹر کے سوا کون ہوسکتا ہے۔۔۔"

جوہی نوید نے غور سے دیکھا۔ عارف صہبائی ہمیشہ چونکا دینے والے انجام سے کہانی کو موڑ دیتے۔ اتنا غیر متوقع کہ وہ مہجور ایڈیٹر ہونے کے باوجود کبھی کبھی حیرت میں رہ جاتی۔ سب ہی ان کے اس فن کے قائل تھے لیکن ان کی یہ طلب' یہ آرزو اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ یہ خواہش تو اس کے دل میں جنم لے سکتی تھی جسے اپنے قلم پر بھروسا یا اپنی شہرت پر یقین نہ ہو۔ آخر وہ کسے چونکانا چاہتے تھے۔ کیا لکھنا چاہتے تھے۔ یہی معاملہ جواب طلب تھا۔ سو اس نے گلا کھنکھار کے دریافت کیا۔

"مسٹر عارف! آپ درحقیقت کیا کہنا چاہتے ہیں؟ آپ کس طرح کی تحریر لکھنا چاہتے ہیں۔۔۔؟"

"بالکل نئے انداز کی جس کا ایک ایک لفظ دل کو چھوتا ہو اور لوگ جب اسے پڑھیں تو پہلے سے ان کے پاس موازنے کے لئے ایسا کوئی واقعہ نہ ہو لیکن اسے چھوڑیے یہ تو بہت پرانی خواہش ہے۔ بات تو آپ کی کہانی کی تھی۔۔۔"

اس نے محسوس کیا۔ جان نہیں چھوٹ سکتی تو بولی۔ "میری کہانی بہت مختصر ہے سر! صرف اتنی کہ میں پیدا ہوئی۔ میں نے دکھ جھیلے اور اب اپنی آخری منزل کی طرف رواں دواں ہوں۔۔۔"

"ارے یوں نہیں کہتے پلیز دیکھئے مجھے تکلیف ہوگی۔۔۔" عارف صہبائی نے اس کے بال بے تکلفی سے چھوئے تو اسے کرنٹ سا لگا۔ دل کے سنگھاسن پہ رکھا ان کی عظمت کا بت ڈگمگایا اور عارف صہبائی اس کی زرد رنگت سے حظ اٹھا کر ہنستے ہوئے بولے۔

"مس جوہی! آپ نہیں جانتیں' میں آپ کو کس قدر پسند کرتا ہوں صرف ایڈیٹر کی نظر سے نہیں بلکہ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے بھی۔ اس لئے میری یہ تمنا بے جواز نہیں اگر میں آپ کے متعلق تفصیل سے جاننا چاہوں۔۔۔"

جوہی نوید کو پتنگے سے لگ گئے ان کی اس بے جا ضد پر مگر بہرحال وہ خود پر قابو پا کر بولی۔

"میری کہانی اتنی ہے سر! میری ماں ایک بہت دین دار عورت تھیں جن کی شادی میرے والد سے ہوئی۔ میری والدہ اور والد دو مختلف دھارے تھے جن کا ملاپ ناممکن تھا۔ وہ مشرقی تھیں تو پاپا مغربی زندگی گزار رہے کہ اچانک میں نے دنیا میں آنکھ کھولی اور پتا نہیں کیوں آنکھ کھولی۔ دنیا ایسی جگہ تو نہیں جہاں رہا جائے۔ یہاں ہر ہر مقام پر ایک شخص دوسرے کا استحصال کررہا ہے۔ جبر کررہا ہے۔ موت اور رزق اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے مگر پھر بھی مٹی کے پتلوں کا زعم خود آرائی کسی طور کم نہیں میرے والد بھی ایسے ہی ایک مٹی کے خدا تھے جنھوں نے میری والدہ سے ہمیشہ اپنی پوجا کرائی۔ میری والدہ شوہر کو مجازی خدا کا درجہ دیتی تھیں مگر انہوں نے کبھی انہیں انسان نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ انہیں طلاق دے دی۔ یوں میری والدہ کی بہت جلد دوسری شادی کردی گئی۔ والدہ نے میرے وجود سے اپنے شوہر کو ناآشنا رکھا مگر میرے لئے تڑپتی رہیں۔ میں صرف دو برس ہی کی تو تھی۔ اس لئے والدہ کے لئے بہت زیادہ تڑپتی تھی۔ یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح یہ راز بھی کھل ہی گیا اور میرے سوتیلے والد نے مجھے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سلمٰی! کتنی بڑی سزا دی ہے تم نے اسے اپنی ماں سے جدا ہونے کی۔ اتنی پیاری بچی کو تو پھولوں اور خوشبوؤں میں رکھ کر پالنا چاہئے تھا۔ جمیل نے تو مجھے یہ راز

...ری زندگی میں زہر گھولنے کے لئے بتایا تھا مگر مجھے ...ت کہ اس نے میری زندگی کو خوشیوں سے بھر ...یوں کے لئے تو سدا میرا دل موم رہا ہے۔ ...ل میری کوئی بہن نہیں ناں' والدین کی اکلوتی ...وں اس لئے یہ رشتہ مجھے بہت امیر ...والا لگتا ہے۔" پھر بس یوں میں ایک خوف کے ...ے مسرتوں کے سایہ دار شجر کے نیچے زندگی ...رتی چلی گئی' پاپا بہت محبت کرنے والے بہت ...بہت عظیم آدمی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ...بھائی اپنی کار پر تو نکلے اور زندگی سہل لگنے لگی۔"

...کہہ کر چپ ہوئی تو عارف صہبائی نے کہا۔

"مس جوہی! یہ کہانی یہاں مکمل تو نہیں لگتی۔ یہ تو ...نے اپنی والدہ کی کہانی پر اپنے نام کا سرورق لگا کر ...یش کردیا۔ آپ کی اصل کہانی کیا ہے میری مراد ...سکشن یا کسی ایسے موسم کی داستان سے ...کے باعث آپ کی دھڑکنیں تیز ہوئی ہوں۔۔۔"

...نے ہولے سے اس کا ہاتھ بھی تھام لیا تو اس ...ل کی دھڑکن بلاوجہ خود بخود بڑھ گئی مگر وہ آہستہ ...ہاتھ چھڑا کر بولی۔

...سوری سر! ایسا کوئی لمحہ میری زندگی میں ابھی تک ...آیا۔"

...یا نہیں یا آپ نے در دل کھولنا ضروری نہیں ...۔"

...سر! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سوالوں سے ...کون سا مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں۔"

"...ت اہم مسئلہ مائی ڈیر! کہانی اسی موڑ پر رکی ...کہانی کا مین کردار کسی سے اظہار مدعا چاہتا ہے ...زندگی اور موت کا فیصلہ کرسکے۔۔۔"

"...مطلب سر۔"

"...مطلب یہی کہ وہ چاہتا ہے۔ لڑکی اپنے جذبات کا ...ڈالے مگر لڑکی انا خودداری میں جکڑی ہوئی ...مصر ہے۔"

"...تو لڑکیوں کی مجبوری ہے سر! ویسے دکھائیے کیا ...۔" اس نے مسودہ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا ...عارف صہبائی نے روک لیا۔

"مس جوہی پلیز' مسودے کو چھوڑیئے۔ آپ بتایئے ناں آپ کی زندگی میں کوئی خوشبو لمحہ آیا نہیں یا آپ نے در دل کھولنا ضروری نہیں سمجھا۔۔۔"

"دونوں باتیں سمجھ سکتے ہیں آپ۔ دراصل مجھے نمائشی جذبات واضح کرنے سے سدا کی چڑ رہی ہے۔ دوسرے میری حقیقت پسندی مجھے دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں کم خوابوں میں مبتلا کرتی ہے۔۔۔"

"لیکن مس جوہی! عورت محبت کے سوا ہے کیا؟ تمام تر حقیقت پسندی سے اگر اس کی تشریح کریں تو ثابت ہوتا ہے۔ عورت محض خواب ہی کا تو دوسرا روپ ہے جبکہ آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ کی حقیقت پسندی آپ کو خوابوں سے دور رکھتی ہے۔۔۔"

"جی ہاں' یہ حقیقت ہے کہ میں خواب دیکھنا تو ضرور پسند کرتی ہوں مگر جو خواب ذوق پرواز یا خودی کے پر کترنے کا سبب بنیں۔ میں ان خوابوں کو آنکھوں سے نوچ پھینکنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔"

"نوچ پھینکنے سے مراد آپ نے واقعی کوئی خواب دیکھا تھا۔"

"کہہ سکتے ہیں آپ لیکن یہ خواب قطعاً" طلب یا تمنا سے پر نہیں تھا۔ اسے آپ صرف عقیدت مندی بھی سمجھ سکتے ہیں۔۔۔"

"عقیدت مندی اور محبت بالکل اچھوتا کمبی نیشن ہے۔ آپ اس خواب کا نام بتائیں گی۔"

"سوری سر! مجھے لگتا ہے۔ میں اب آپ کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکوں گی۔۔۔"

وہ مضبوط لہجے اور ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن عارف صہبائی کی طرف سے اب بھی خوفزدہ تھی' یہ اور بات کہ اس کے یوں بے رخی سے کھڑے ہونے پر بھی ان کے لبوں کی مسکراہٹ نہ گئی۔ وہ پرسکون کیفیت میں مطمئن سے اب بھی اسے ہی تکے جارہے تھے۔ اتنی محویت سے کہ اس کا دل ڈول رہا تھا۔ دھڑک رہا تھا بری طرح سے ہراساں تھا۔ اس بات سے کہ کہیں کسی کمزور لمحے میں وہ اپنے دل کا اتنا بڑا راز کہہ ہی نہ ڈالے کہ پھر ہاتھ پلے کچھ بچے ہی نہ۔ لڑکی کی عزت نفس مان' بھرم اس خاموشی ہی میں تو مضمر

ہے۔ یہی تو وہ یقین ہے جس کے بل پر وہ زندگی سے نظر ملا کر چل سکتی ہے۔ چند لفظ کہنے میں کتنے ہی بے وقعت و آسان لگیں مگر سب کچھ داؤ پر لگا جاتے ہیں اور وہ زندگی بھر کی عزت چند لفظوں کے عوض ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ سچ تھا کہ اس کے دل میں ان کے لئے محبت کا جذبہ تھا مگر وہ کسی دوسرے کے گھر پر بھی قبضہ کرنے والی نہیں بن سکتی تھی لیکن اگر یہ معاملہ نہ بھی ہوتا وہ تب بھی محبت کو سنبھال کر عقیدت ہی کو اپنی شخصیت کا ہراول دستہ بنائے رکھتی۔ محبت تو عقیدت سے کچھ درجے نیچے کی بات ہے اور وہ مسٹر عارف کو بلند درجے پر رکھنا چاہتی تھی۔

"مس جوہی! آپ شاید جا رہی تھیں...؟" یکلخت عارف صہبائی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اس نے چادر سنبھالی۔ مسودہ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مسٹر عارف نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اب بھی پہلے کے موڈ میں تھے سو اس نے گلا کھنکھار کر کہا۔

"سر! آپ کی تحریریں پڑھ پڑھ کر مجھے بھی لکھنے میں تھوڑی بہت شد بد حاصل ہو گئی ہے..."

"کیوں نہیں 'ایک اچھے ایڈیٹر کے لئے لازمی ہے' وہ اچھا رائٹر ہو۔ سمجھنے والا ہو مگر مس جوہی! آپ اچھی رائٹر ایڈیٹر ہونے کے باوجود ایک ناکام قاری ہیں..." انہوں نے درمیان سے اس کی بات قطع کر کے کہا تو وہ رک کر انہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔

"یہ! یہ آپ نے کیسے کہہ دیا سر ایک اچھا ایڈیٹر میں تھوڑا تھوڑا قاری اور رائٹر ہو' تب ہی تو وہ بہتر صلاحیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں۔ میں ایک ناکام قاری ہوں..."

"ہوں کیونکہ میں نے تمہیں جتنا سمجھا ہے۔ اس سے یہ بات واضح تر ہے۔ تم صرف لفظوں کو پرکھنے تک قاری ہو۔ سفید کاغذ پر بکھری نیلی کالی روشنائی سے جھانکتے لفظ گنتی ہو۔ غور کرکے جہاں لفظ بکھر رہے ہوتے ہیں۔ انہیں لڑی میں پرو کر ترتیب دیتی ہو۔ فاضل لفظ تمہارا قلم مٹاتا چلا جاتا ہے لیکن جوہی! کیا یہ ضروری ہے کہ جو لفظ تمہیں غیر ضروری یا فاضل لگے' وہ واقعی ہو بھی۔ تمہیں کیا پتا۔ ایک رائٹر نے کس لفظ کو کتنی تپسیا' کتنی ریاضت کے بعد لکھا۔ کس جملے میں اس کا کیا تجربہ ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ اس نے اس جملے میں زندگی کی کتنی ہی ساعتیں ریزہ کی ہوں پھر وہ ایک آگہی کا لمحہ تراشا ہو جوہی! تم واقعی ناکام قاری ہو..."

جوہی نے کہنا چاہا۔ نئی دلیل دے کر اپنی قابلیت ثابت کرنا چاہی مگر لفظوں نے ساتھ نہ دیا اور وہ مسودہ ان کی ٹیبل پر چھوڑ کر اٹھ آئی۔

دوسرے دن شامی سے ملاقات ہوئی تو اس نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں بھئی۔ کیا ہوا تمہارے ان ونڈر اولڈ مین کی کہانی کے موڑ کا۔"

"کہانی رک گئی ہے شامی..." اس نے مختصراً کہہ کر جان چھڑائی پھر دوپہر کا کوئی وقت تھا جب عارف صہبائی کہانی سمیت اس کے دفتر چلے آئے۔

"مس جوہی! یہ لیجئے آپ کی امانت..."

اس نے مسرت سے دمکتے چہرے سمیت کہانی تھامی یہ لمحہ واقعی خوش کن تھا ورنہ وہ تو سوچے بیٹھی تھی کہ ان کا پرچہ اب ان کی تحریروں سے محروم ہے۔ رائٹر تو یوں بھی حساس اور بجھے دل جلے ہوتے ہیں۔ اس لئے امید واثق تھی کہ وہ کل کے رسالے ان کے لئے اپنی کوئی تحریر نہ دیں گے مگر خلاف توقع چلے ہی آئے تو اس نے ان کی مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ کولڈ ڈرنک پی رہے تھے۔ تب ہی اس نے بے کلی سے تحریر کے آخری صفحے دیکھنے شروع کیے۔ کہانی حسب روایت بہت اچھوتی تھی مگر اختتام تک آتے آتے ایک خلش سی رہ گئی۔ اس نے سرسری سا پوچھا۔

"مسٹر عارف! یہ کسک' تحریر کی یہ خلش بہت سے ذہنوں کو ہانٹ کرے گی۔ کیا اس کا اختتام خوش گوار نہیں ہو سکتا..."

عارف صہبائی نے دیکھا پھر گہری سانس سینے میں کھینچ کر کھنکھارے۔

"مس جوہی! ہر اچھے افسانے میں ایک کسک ہوتی ہے جو ہمیں کئی دنوں تک اس تحریر کے سحر میں گرفتار رکھتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے...؟"

"میں آپ سے متفق ہوں لیکن مسٹر عارف! لوگ اگر پڑھنا چاہتے ہیں تو ان کی ترجیح ہوتی ہے کہ ان کے لئے فل انٹرٹینمنٹ ہو۔ ان کا ذہن پر سکون اور لبوں پر ہنسی ہو۔ زندگی میں تو یوں بھی ہنسنے کے کم مواقع ملتے ہیں تو کیا ضروری ہے۔ ہم اپنی کہانیوں میں بھی دکھ ہی کی تصویر کشی کریں۔"

"نہیں... ضروری نہیں لیکن بعض کہانیوں کی اپنا انجام خود ساتھ لایا کرتی ہے جیسے اس کہانی کی راوی کے ساتھ وہ انجام ہمراہ آیا کسی پردیس سے لوٹنے والے عزیز از جاں کی طرح مس جوہی! آپ ہی بتائیے۔ کوئی طویل سفر طے کر کے آئے' چاہے وہ دکھ بھرا دل نہ ہو تو ہمیں زیب دیتا ہے کہ ہم اپنا در بند کر لیں..."

"آپ نے ٹھیک کہا بلکہ میں خود بھی اس کی قائل ہوں کہ دکھ اور خلش کے رنگوں سے جو تصویر بنائی جائے۔ وہ زیادہ تابناک ہوتی ہے۔ زندگی کی آرٹ گیلری میں سب سے اہم ترین۔ لیکن پھر بھی ہمیں کبھی ہنسی بھی تو پینٹ کرنی چاہئے۔ آپ اس بار کبھی کچھ لکھئے ناں...؟"

"کوشش کروں گا۔" وہ خاموشی میں لپٹے ہوئے چلے گئے۔ جوہی ان کی طلب جانتی تھی مگر پذیرائی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو آنکھیں بند کرکے کام میں مشغول ہو گئی۔

اور ایک دن شامی نے ایک دن زندگی کا سب سے اچھا افسانہ اس کی میز پر لا رکھا کتنی دیر تک تو حیران ہی رہی۔ ساتھ کام کرتے کافی عرصہ ہو گیا تھا لیکن کبھی خیال ذہن میں نہیں آیا تھا۔ وہ شامی کے بارے میں ایسا سوچے لیکن اب جبکہ اس نے پرپوز کر ہی ڈالا تو اس نے باقاعدہ طریقے سے اس خواہش کے اظہار کا راستہ سمجھا دیا تھا۔ ماں اور بھائی سب نے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ وہ سب ہی چاہتے تھے کہ وہ بھی زندگی کی خوشیوں سے اپنا حصہ پانے والی بنتی لیکن بات منگنی پر آ کر رک گئی تھی۔ شامی منگنی کے بعد اپنے شعبے ہی سے منسلک یورپ کے ٹور پر نکل گیا تھا۔ اس کی کچھ فوٹو گرافک ایگزیبیشن بھی تھیں اور کچھ وہ کیمرہ ورک میں مزید مہارت کے لئے ایک آدھ کورس بھی شروع کرنے والا تھا۔ فوٹو گرافی اس کا ذریعہ معاش ہی نہیں اس کا شوق بھی تھا۔ اس لئے وہ اپنے اس فن اور شوق میں مزید ندرت کی طرف قدم بڑھانے کو ہمیشہ تیار رہتا۔ چھوٹی سی عمر میں اس کا کام بڑے پیمانے پر نہ صرف منظر عام پر آیا تھا بلکہ پسندیدگی کی سند بھی پا چکا تھا لیکن وہ اب بھی خود سے مطمئن نہیں تھا۔ شاید یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔ بقول اس کے جو شخص جہاں مطمئن ہوا وہیں راکھ ہوا۔ مٹی کے ڈھیر میں ڈھل گیا کیونکہ تجسس ہمیشہ زندگی کو مہمیز دیتا ہے۔ رفتار ہی زندگی کا پتا سمجھاتی ہے سو وہ ہمیشہ نئے گوشے اور نئے جہانوں کو فتح کرنے کے لئے تیار رہتا۔ یہ ٹور اس کا پیش خیمہ تھا لیکن وہ اتنی دور جا کر بھی جوہی کو بلا مبالغہ دن کے چوبیں گھنٹے یاد کرتا۔ اتنے تواتر سے کہ جوہی کو خود پر رشک آنے لگتا۔ وہ اپنے جذبات سے گھبرانے لگتی اور جب اسے یہ معرکہ درپیش ہوتا' وہ شعوری طور پر عارف صہبائی کے کسی نہ کسی ناول پر ان سے بحث کرنے لگتی تاکہ لفظوں میں دل کا ابال نکلتا رہے۔ پھپھولے پھوٹتے رہیں۔ اندر ہی اندر تو لاوا ابلتا رہتا ہے۔ بس وہ اس شوریدہ سری سے بچنے کے لئے ان سے لایعنی بحث و مباحثہ کرتی رہتی اور عارف صہبائی جواب دیتے رہتے کہیں گم ہو ہو جاتے اور ان پر جب یہ چپ کا دورہ پڑتا تو اسے لگتا کاغذ پر بکھرے لفظ ان سے کہیں زیادہ شور مچاتے' اپنے ہونے کا یقین دلا رہے ہیں۔ وہ پڑھ کر کہتی۔

"مسٹر عارف! آپ کے لفظ کس قدر بولتے ہیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کی طرح اپنا احساس دلاتے ہوئے' کہانی نہ بولے۔ تب بھی یہ لفظ خود ایک کہانی بن جاتے ہیں۔"

"شاید لفظوں کی قسمت میں کہانی ہی بن جانا لکھا ہوتا ہے۔"

"مگر مسٹر عارف! کہانی لفظوں کا ہی دوسرا روپ

ہے۔"

"ہاں مگر بعض لفظ گونگے ہوتے ہیں۔ بس سن سکتے ہیں۔ بول نہیں پاتے اور ایسے لفظ کہانی ہی بن جاتے ہیں۔ مس جوہی! آپ نے کہانی بن جانے والے لفظوں کی تربتیں دیکھی ہیں ان کے نام کا کتبہ تک نہیں ہوتا۔ ان کی لوح مزار پر لوگ یونہی سرسری سا گزر جاتے ہیں جانے بغیر کہ وہاں کتنا قیمتی و نایاب لفظ دفن ہے۔"

"مگر مسٹر عارف! لفظ لکھنے والا لفظ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ لکھنے والا ہو تو بے شمار لفظ صفحہ قرطاس پر بکھرتے چلے جاتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔ ایسا بھی ہو لیکن بعض دفعہ لفظ بہت قیمتی ہو جاتے ہیں۔ مس جوہی! کہنے نہ کہنے کے درمیان قید یا کبھی کہہ دینے کے باوجود رد کر دیئے جانے کے غم سے نڈھال۔ آپ نے ایک بار کہا تھا۔ میں مسکراہٹ پر کچھ لکھوں۔ مس جوہی! آپ بتایئے آپ نے کبھی کسی غم زدہ لفظ سے تعزیت کی۔"

جوہی کیا کہتی۔ خاموش کی خاموش رہ گئی لیکن عارف صہبائی اسی تواتر سے یہ سوال کیے چلے گئے۔

خاموشی کی زبان سے۔ اتنے خلوص سے کہ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم گردانے لگی' مگر یہ احساس جرم یکلخت ہی ختم ہو گیا۔ بس اچانک ہی۔ جب اس کے دفتر میں وہ قتالہ عالم' حسن کی دیوی داخل ہوئی۔ عمر تیس بتیس کے درمیان تھی لیکن رعب حسن اور جمال کا یہ عالم تھا کہ اب بھی نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ شربتی آنکھوں کے جام پینے کو اب بھی دل للچا جاتا۔ وہ پہلی بار میں تو اس حسن مجسم کی کوئی تعریف کر ہی نہ سکی تھی۔ اک نگاہ ٹھیک زاویے سے جما بھی نہ پاتی کہ عکس جادو بیانی کرنے لگتا۔ خاموش تھی مگر لگتا۔ انگ انگ تکلم پر آمادہ ہے سو بدقت اس نے اپنی یہ متاثر ہو جانے والی کیفیت چھپائی۔ کرسی سے کھڑی ہو کر اخلاق سے بولی۔

"فرمایئے محترمہ! آپ کو کس سے ملنا ہے۔؟"

"صرف تم سے۔" نہایت نخوت بھرا لہجہ' وہ احساس تذلیل سے بلبلا اٹھی۔

"مگر مجھ سے آپ کیوں ملنے کی خواہش مند تھیں۔؟"

"صرف اس لئے تاکہ دیکھ سکوں کہ وہ کون ہے جس کے لئے عارف مجھ سے بے مہری روا رکھتے ہیں۔"

"پھر کیا دیکھا آپ نے۔؟" نہ جانے اسے انہیں چڑانے میں کیوں مزا آنے لگا۔

اور وہ حسن قاتل پیر پٹخنے لگا پھر سنبھلا تو نازیبا شہکی کٹ بالوں کو جھلاتا ہوا گویا ہوا۔

"بظاہر تم میں ایسی تو کوئی بات نہیں کہ کوئی تمہیں ایک بار دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی تمنا کرے لیکن تم خوش قسمت ہو کہ وہ تمہیں سراہتے ہیں۔"

"یقیناً" مسٹر عارف کے سراہنے کا انداز نہایت شائستہ اور مہذب ہی رہا ہو گا۔ مسز عارف! میری تعریف سے آپ کو دکھ ہوا تو مجھے افسوس ہے لیکن یاد رکھئے مسٹر عارف کے معیار کو چھونا ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔"

"ہا۔ آں۔ کس معیار کو چھو لیا تم نے۔؟" بیگم ان کے انداز میں تعلیم کم انتقام سے زیادہ جہالت جھلک مارنے لگی مگر وہ جوہی شامی تھی استقامت سے کھڑی اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ مسٹر عارف اور اپنے سیاہ مقدس تعظیم بھرے تعلق کی روداد بیان کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے لفظ ختم ہو گئے مگر تعلق کی پیچ احاطہ تحریر میں آئی تو تعلق کی نکتہ آفرینی واضح ہوئی اور مسز عارف نے سوچا۔ لڑکی انہیں بنا رہی ہے۔ بس اسی پہلو سے کھا گئیں۔ کھٹ کھٹ کرتی آئی تھیں۔ دھڑ دھڑ لوٹ گئیں۔ اس نے سکھ کا سانس لیا مگر شام کے عارف کا متوقع فون آ گیا تو اس نے جی جان سے کہا۔

"مسٹر عارف! کیا میں نے کبھی آپ سے کسی کے تعلق کی امید لگائی۔ آپ نے کبھی میرے ... سے ایسا عندیہ لیا جو بیگم صاحبہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئیں۔ انہیں سمجھایئے۔ وہ غلط چابی سے دروازہ کھول رہی ہیں۔"

عارف صہبائی خاموش تھے' اس کے چپ ہونے ... لے تو صرف اتنا۔ "غلط چابی سہی مگر مس جوہی! ... لیے کہہ سکتی ہیں۔ وہ غلط دروازہ ہی کھول رہی ... جوہی کاش تمہیں پتا ہوتا۔ تم ہی میری شخصیت ... کوڈ ہو جس سے میں لاینحل مسئلہ کے بجائے ... کی حقیقت کی طرح واضح ہو سکتا ہوں۔"

"مسٹر عارف! آپ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ... میں اور آپ میں صرف ایک وجہ تعلق ہے ... صرف رائٹر ایڈیٹر کا رشتہ ہے۔"

"شاید ایسا بھی ہو لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ ... کوئی مجبور نہیں کر سکتا سوائے میرے دل کے۔"

"تو پھر سن لیجئے۔ مجھے بھی کوئی مجبور نہیں کر سکتا ... سوائے میری انا اور خودداری کے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں ... کے لئے آپ کی تحریریں صرف میری ذات ... آپ حاصل کرنے کے لئے ہیں تو میں واضح کر دوں ... میں آج ہی اس ادارے سے استعفیٰ دے رہی ... جو کام یا بات میرے بھرم' میری ناموس پر حرف ... کا سبب بنے وہ مجھے قبول نہیں۔ آپ کی ... یں ہوں یا آپ۔ میرے لئے اس لئے اہم تھے کہ ... کا تعلق ہمارے قلمی معاونین میں سے تھا اور ... ۔"

"اور بس۔ کیا واقعی مس جوہی! ہمارا تعلق یہی ...؟" انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا مگر لگا سوال ... کہیں زیادہ دکھ تھا۔ اس کے لہجے میں۔ خلش' کسک ... ہر افسانے ہی میں نہیں ان کے لہجے میں بھی ... تھی مگر اب وہ مزید کسی قسم کی معرکہ آرائی میں ... کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ نوکری اس کا ... بھی مجبوری نہیں۔ عقیدت جمع محبت کی قائل ... بھی' وہ لیکن کسی رسوائے زمانہ کہانی کا کردار بننا ... محبت بھری داستان میں ولن ہونا وہ قطعاً گوارا ... سکتی تھی۔ جبکہ اس کے خوابوں کی تعبیر اگلے ... موڑ پر اس کی منتظر تھی پھر بھلا وہ اس اکھاڑ ... کا حصہ کیونکر بنتی اگر مسٹر عارف کا اپنی مسز کے ... کوئی جھگڑا ہے بھی تو اسے ان دونوں کو خود ہی حل ... حل کرنا چاہئے۔ وہ کیوں بیچ میں گھسیٹی جائے۔ بس ... کر اس نے مزید بحث کرنا فضول سمجھا۔ فون رکھ دیا۔

*_*_*

مگر دوسرے دن اخبار کی سرخی چیختی ہوئی سی تھی۔ مسٹر عارف کی کار کا زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بیگم عارف معمولی زخمی ہوئی تھیں جبکہ وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھے مگر اس وقت اس کا کسی بھی تعلق' انسیت کے سبب ہاسپٹل دوڑا جانا جلتی پر تیل کا کام کرتا۔ سو وہ جی کڑا کر کے گھر میں رکی رہی۔ دفتر سے سید نور عالم کا کتنی مرتبہ فون آ چکا تھا۔ وہ ہاسپٹل سے ہو کر بھی آ گئے تھے اور اس کے ہاسپٹل نہ پہنچنے پر اس کی انتہائی کج خلقی پر خوب غصہ ہو رہے تھے اور یہ ان کا حق تھا۔ وہ ان کو اپنے بزرگوں کی طرح سمجھتی تھی اس لئے ان کی تمام تر کڑوی کسیلی باتوں کو سن رہی تھی مگر آخر کب تک۔

شام تک اس کا اپنا بھی ضبط جواب دے گیا۔ کسی بھی تعلق سے سہی آشکار یا چھپے ہوئے تعلق سے ایک طویل راہ و رسم تھی۔ ان کی لفظوں کی جادوگری کی اسیر تھی وہ۔ اس لئے خوبصورت گلاب کے پھولوں کا گلدستہ لئے وہ بالآخر ہاسپٹل جا پہنچی وہ ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار تھی مگر کمرے میں سوائے عارف صہبائی کے کوئی نہیں تھا۔ ہاں بس کمرے کے باہر ایک بوڑھا ملازم تھا جو مناجات میں مصروف تھا۔

"صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے۔؟"

"بس ٹھیک ہی ہیں۔ دعا کریں اللہ کرم کرے۔ میرے صاحب نے بڑے دکھ دیکھے ہیں صاحب نے میرے۔" وہ ایڈیٹر تھی۔ رائٹر نہیں کہ اس جملے سے کہانی کشید کر لیتی۔ سو سر اٹھائے اندر داخل ہو گئی۔ گلدستہ رکھ کر واپس لوٹ آئی پھر تیسرا دن تھا جب وہ پرائیویٹ روم کا دروازہ کھول رہی تھی تو اس کے کانوں میں مسز عارف کی آزردہ آواز سنائی دی۔

"پلیز عارف! مجھے معاف کر دیجئے۔ دیکھئے میں شرمندہ ہوں اپنے کیے پر۔"

"یہ حادثہ صرف شرمندگی کا متقاضی ہے۔ بولو عصمی! کیا واقعی ایک سوری کر دینے سے میری زندگی

کے اس بوجھ میں کمی آجائے گی؟ آخر کیا ملا تمہیں مجھے اس طرح معذور کرکے۔"

"معذور نہیں عارف! ڈاکٹرز کہتے ہیں آپ بہت جلد چلنے پھرنے لگیں گے۔ اور"

"اور یہ کہ یہ محض طفل تسلیاں ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میں اب کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکوں گا اور یہ محض تمہاری دیوانگی کے سبب سے ہوگا۔"

"عارف پلیز' میں واقعی آپ کی مجرم ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں لیکن یہ بھی تو دیکھئے۔ میں نے بھی خود کو صرف آپ کے لئے مختص کر دیا ہے۔ میں صرف آپ کی ہوں۔"

"میری ہو صرف میری ہو! کاش یہ بات تمہیں پہلے پتا چل جاتی۔"

"پتا تھی مگر کبھی یقین نہیں آیا تھا مجھے۔"

"یقین آ بھی کیسے سکتا تھا تمہیں۔ تمہاری آنکھوں پر تو حسد اور شک کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ تم نے مجھے صرف پیسہ کمانے کی مشین سمجھا کبھی نہ سوچا کہ مجھے بھی محبت اور توجہ کی ضرورت ہو سکتی ہے۔"

"سوچا تھا اکثر سوچا تھا مگر آپ کے چھن جانے کے خوف نے کبھی مجھے ٹھیک طرح سے محبت کے قابل ہی نہ چھوڑا۔"

عارف صہبائی کے لہجے میں بھراہٹ آگئی تھی۔ شاید انہوں نے مسز عارف کا یہ جملہ سنا ہی نہیں وہ تڑپ کر بولے۔

"**عصمی**! تمہیں پتا ہے' مجھے زندگی میں صرف شک اور حسد کی عادت سے خوف آتا تھا۔ یہ عادتیں انسان کی خوشیاں آگ کی طرح کھا جاتی ہیں۔ بہت سے تعلق بنے بگڑے مگر میں نے محض ان خامیوں کے باعث ان تعلقات کو صرف ہیلو ہائے تک محدود رکھا مگر مجھے تم ملیں تو لگا ہر تلاش منزل ہوئی لیکن اب کھلا کہ مل جانا ہی تو سراب ہے۔ کسی کے پیچھے بھاگتے عمریں ریت کرنے سے زیادہ تلخ مگر کڑوا ترین سچ۔ **عصمی**! میں نے تمہیں پا کر کھو دیا۔ تم نے ہر ایک کو چاہا۔ صرف مجھے رد کرنے کے زعم میں ہر ایک سے عہد نبھایا۔ بس مجھ سے بدعہدی کی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ بدگمانی ہے عارف! ورنہ زندگی کتنی ہی خوش رنگ' چکاچوند کرتی راہیں کھلی تھیں میں تھمی رہی تو صرف آپ کی چاہ میں۔ میں نے عمر ریت کی آپ کی چاہ میں۔ آپ اس سے بڑا میری محبت کا جواب لا سکتے ہیں کہ آپ کو شیئر نہ کرنے کی خواہش میں۔ میں نے اپنی فطری خواہشات کو دبا رکھا۔ مجھے آرزو تھی کہ میں معصوم سی زندگی پوری کرتی مگر مجھے لگا وہ ہنسنے والے ہونٹ بھی مجھ سے آپ کو جدا کرلیں گے اور میں آپ کو کھونے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ بس اس لئے میں نے ممتا کا روپ لیے ماں کہنے اور ماں سننے کی لذت بھی گنوادی۔ میں واقعی حاسد اور شکی ہوں مگر یہ میری مجبوری ہے عارف! او دیکھئے۔ کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے۔؟"

"کر سکتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں نے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ لینا چاہوں بھی تو نہیں لے سکتا کیونکہ میرا دل محبت سے پر ہے اور محبت بھرے دل کسی کو دکھ نہیں دیتے۔"

ٹھنڈی سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ جوہی نے لوٹنا چاہا مگر اپنا نام سن کر اچانک تھم گئی۔ مسز عارف جوہی سے مسٹر عارف کے تعلق کی نوعیت جاننا چاہتی تھیں۔ اس کی زندگی آنکھوں میں کھنچ آئی تھی اور مسٹر عارف تھے۔ سکون سے کہہ رہے تھے۔

"جوہی صرف میری اصلاح کار تھی۔ ایڈیٹر اور رائٹر کا تعلق تھا اس کا میرا۔"

اس نے آہستہ آہستہ سانس باہر نکالا سکون کے ساتھ۔ مگر اک کسک ہوئی۔ کیا واقعی وہ سب مسٹر عارف کی ذہنی کاوش تھی' محض نفسیاتی ٹرک اور بس۔ یعنی اتنے عرصے تک وہ مہرے کی طرح استعمال کی گئی تاکہ وہ بے مہر بیوی کے دل کو حسد و شک میں مبتلا کرکے محبت کی طرف لوٹا سکے۔ واقعی کتنا سیدھا سا' آسان سا کھیل تھا یہ۔ مگر وہ جو لفظوں کی سچائی لکھاری کے من کی مصفا کیفیت سمجھتی تھی ساتھ گئی۔ کسی ریموٹ کنٹرول ٹوائے کی طرح مسٹر عارف کے احکامات بجا لاتی رہی۔ جو کہا گیا جو نہیں کہا گیا

[illegible] امراز کی طرح اپنے دل پر ثبت کرتی گئی۔ تضاد [illegible] وفاپن اس کی ذات میں نہیں تھا۔ سو وہ سمجھتی [illegible] دنیا میں بھی کہیں نہ ہوتا ہوگا اگر ہوتا [illegible] تحریروں کی ندرت آفرینی' کہانی کو دو آتشہ [illegible] کا بہانہ ہے۔ اخبار پڑھتی تو سمجھتی حساس لوگ [illegible] کی عبارتوں میں کہیں نہیں لکھے گئے۔ یہ تو [illegible] کی داستان کے چند کردار ہیں۔ جنہیں تاریک [illegible] کا سفر کرنا ہی تھا۔ وہ لکھنے کو تو بہت ہی مقدس [illegible] سمجھتی تھی پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے [illegible] اس کی رائے ڈگمگاتی یا وہ اس کے لفظوں' [illegible] کو تحریف کرکے پڑھتی اور گناہ گار بنتی تحریر کو [illegible] صحیفہ نہ سہی مگر لکھنے والے کی قلبی واردات' [illegible] سچائی کا آئینہ دار ہوتی ہے پھر آئینے میں عکس کو وہ [illegible] جھٹلا دیتی۔ یہی وجہ تھی وہ تحریریں پڑھتی۔ [illegible] میں دیکھتی' اس کو حقیقت مان لیتی لیکن در [illegible] حقیقت ہے کیا؟ وہ اب سمجھی تھی۔

اور یہ دکھ ایسا تھا کہ اس کی روح برداشت نہ کر [illegible] تھی۔ دل کی رگیں سی کٹ رہی تھیں۔ سو وہ منہ [illegible] جانے کے لئے قدم اٹھانے لگی تو قریب سے [illegible] وجود گزرا۔ مہکتا ہوا' مجسم خواب آسا۔ بنا کہے [illegible] نام' مقام بتا دینے والا۔ اس نے نم آنکھوں سے [illegible] فنکار کو دیکھا پھر بس یونہی دل چاہا' جا کے [illegible] اس لفظوں کے ساحر سے کہ اس کا سحر کیوں [illegible] ہوا کہ دل بت ہوگئے اور اسے قالب انسانی [illegible] ڈھالنے کا منتر ہی بھول گیا یا وہ بھی کسی جادوئی کہانی [illegible] کردار تھا جسے اس سمیت ہر شخص ہیرو کے [illegible] میں مان بھرم کے استھان پر بٹھاتا آیا۔ وہ [illegible] پوچھنا چاہتی تھی۔ لفظ سچائی ہوتے ہیں یا صرف داؤ [illegible] بھاتے۔

[illegible] کرلیا تو ان کے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ [illegible] داخل ہوئی۔ عارف صہبائی آنکھیں موندے [illegible] تھے۔ مگر اس کی مدھم چاپ جو شاید خود اسے سنائی [illegible] دی تھی' وہ ان کی روح نے سن لی۔ تار دل پر نغمہ [illegible] گیا۔ بڑی بڑی آنکھوں کے طاقچوں پر سجے [illegible] کی لو مسکرانے لگی۔ بینائی کو خود پر پیار آگیا مگر

وہ ناراض سی کھڑی رہی کہتی بھی کیا۔ تمہید باقی تھی نہ خیال' ہاں البتہ سوال ضرور تھا مگر خود کا جواب ایسا کہ ہونٹ نہ ملتے تھے جو سوچ کر آئی تھی۔ ان کے کردار پر اتنا سفاک تبصرہ کرے گی کہ خود لفظ کانپ کانپ جائیں مگر ذات سامنے تھی۔ کردار گواہی ہونے لگا تھا اور لفظ ہاتھ سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل گئے تھے۔ عارف صہبائی بڑی دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کتنی ساعتیں خاموش گزر گئیں۔ تب انہوں نے ہی پہل کی۔

"مس جوہی! بالآخر آپ نے فیصلہ بدل ہی دیا ناں۔"

اس نے خالی نگاہوں سے انہیں دیکھا پھر تڑپ کر بولی۔ "میرا یہاں آنا کسی فیصلہ کا حصہ نہیں۔ میں تو بس سنت نبوی کے احیاء کے لئے آئی تھی۔"

"صرف فرض نہیں مس جوہی! آپ کے انداز بے قراری میں فرض کی بو نہیں' توجہ محبت کی مشک بو لپٹیں اٹھ رہی ہیں۔ آپ مان کیوں نہیں جاتیں۔؟"

"آخر کیوں مانوں۔ وہ خیال جو کبھی دھیان میں نہیں اٹھا۔ آپ کیوں چاہتے ہیں۔ میں ایک جھوٹے تصور سے آپ کا من برماؤں۔"

"جھوٹا تصور۔ مس جوہی! سچی آنکھیں بھی جھوٹے تصور سا خواب بھی باندھ سکتی ہیں۔ دکھا سکتی ہیں کسی کو۔"

"شاید نہیں لیکن سچے لفظوں کے دعویدار تو بہت فریب بھرے جال آسانی سے بچھا لیتے ہیں۔ نجانے آزاد فضا میں اڑتے پرندوں کو قید کرنے کا ہنر اور تمنا ہی کیوں صیاد کی سرشت میں شامل ہے۔"

"صیاد لازمی تو نہیں ہمیشہ صیاد ہو۔ ادھر دیکھئے۔ مس جوہی! کیا واقعی میں صیاد ہوں۔"

اس نے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تو ان کے لہجے میں زندگی مرنے لگی۔ "مس جوہی! کاش آپ کبھی جان سکتیں کہ میں صید ہوں' سونے کے پنجرے میں قید پر کترا ہوا مجبور و مجبور اک پرندہ۔"

وہ سنے بغیر مڑی جانے کے لئے' مگر آنے والے

راستوں پر وہی حسن مجسم ایستادہ تھا۔ فخر و غرور سے تنی گردن حقارت بھری نظروں سے دیکھنے والا مجسم جمال مگر بے رنگ۔

"تم! تم یہاں کس کی اجازت سے آئی ہو؟ آخر تمہیں بلکہ تم جیسی لڑکیوں کو آسائشوں اور مقام کی حرص کا سیدھا ترین راستہ یہی کیوں دکھائی دیتا ہے۔"

"مسز عارف! آپ ہوش میں تو ہیں....."

"میں ہوش میں ہوں مگر تم شاید اپنا مقام اور حیثیت بھول گئی ہو۔ کسی اور طرف نظر کرو۔ کسی اور امیرزادے کو گھیرو۔ تم سے دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں یونہی ہوتی ہو جادو حشم کے لئے۔"

"مسز عارف.....!" ایکدم اس کا ہاتھ اٹھا اور نقش چھوڑتا چلا گیا۔ ان باتوں کا اس سے بہتر جواب کوئی نہیں تھا۔ گو یہ تہذیب کے خلاف حرکت تھی مگر بدتہذیبی کے آگے آخر تہذیب کب تک مسمریزم کی کیفیت میں رہتی۔ اسے یہی سوجھا' سو وہ جواب دے کر آگے بڑھ گئی۔

مسٹر عارف کی طرف بھی دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

*_*_*

یہاں تک کہ دن پر دن آئے اور گزرتے چلے گئے۔ شامی لوٹ آیا تو اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ وہ مگن و خوش تھی۔ جب اچانک عارف صہبائی ملنے چلے آئے۔ وہ وہیل چیئر پر تھے۔ ملازم ہمراہ تھا۔ بڑی بھابھی نے خوش آمدید کہا اور وہ بہت دیر تک دلائل سننے کے بعد دل برا کئے ان سے ملنے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ مایوں کے پیلے جوڑے میں میں وہ رنگوں کی کان بن گئی تھی۔ ابٹن اور زرد رنگ کے امتزاج میں اسے لگنا تو زرد چاہئے تھا مگر زرد رنگ میں خوشیوں' مسرتوں کے روپہلے رنگ بھرے خوابوں نے طوفان مچا دیا تھا۔ عارف صہبائی کتنی دیر تک اسے تکتے رہے پھر گلا کھنکار کر بولے۔

"مس جوہی! میں اس دن عصمی کے رویے کی آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔"

اس نے تنفر سے انہیں دیکھا۔ اور طنز سے کہا۔

"حالانکہ سر! معافی تو مجھے مانگنی چاہئے تھی۔ آپ کی عزت یا آپ بیگم کے ساتھ بدسلوکی تو میری طرف سے ہوئی تھی....."

"نہیں مس جوہی! وہ سلوک ایک عزت مآب لڑکی کا درست ردعمل تھا' مجھے خوشی ہوئی تھی آپ کے ردعمل پر۔ یقین کریں اگر آپ اس وقت خاموشی سے سب سہہ جاتیں تو میں آپ کو بے حس بے روح سمجھتا۔ مجھے دکھ ہوتا۔"

اس نے نظریں اٹھائیں پھر بولی۔

"واقعی کیا آپ کو دکھ بھی ہوتا ہے۔ آپ پر دکھ کے معنی آشکارا ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے سر! آپ بھی کھوکھلے خولی لفظوں کو پرونے' سوت کات کات کر رواں کر دینے اور یقین کا آنچل سروں سے کھینچ لینے والوں کی صف میں ہیں۔ میں آپ کو اس سخی کے روپ میں سمجھتی ہوں جو بستیوں میں آنکھیں چھین کر چراغ بانٹتا پھرتا تھا۔ آپ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں سر مو برابر نہیں....."

لہجہ بھرا گیا تو مسٹر عارف نے اسے دیکھا۔ پوری توانائی سے۔ پھر کچھ کہے بغیر ملازم کو چلنے کے لئے آوازیں دینے لگے۔ اس نے بڑھ کر تھاما بھی نہیں روکا بھی نہیں۔

*_*_*

اور زندگی نئے سفر پر محو پرواز ہو گئی شامی نے سب سے پہلے اس پر استعفیٰ واپس لینے کا دباؤ ڈالا۔ ایک تو سید نور عالم کی منشا نہیں تھی۔ دوسرے وہ خود اپنا ویژن کی تخصیص کے آزادی کا قائل تھا سو اسے حکم ماننا پڑا۔ مسٹر عارف کی تحریریں ابھی تک اسی سے مل رہی تھیں لیکن خاموشی کا جو حصار تھا وہ تھم سا گیا تھا مگر یکلخت یہ تھم جانا ہی تو بھونچال کا ثابت ہوا۔ اچانک مسٹر عارف برین ہیمبرج کا شکار ہوگئے جب تک وہ اور شامی پہنچے تب تک زندگی کے اسٹیج پر پردے گرائے جانے کا انتظام ہو رہا تھا اور وہ بوڑھا ملازم مسٹر عارف کی پٹی سے لگا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اتنی دل گیری سے کہ بیگم عارف اس کی کے آگے گنگ تھیں۔

"بابا جی! حوصلہ کریں.....!" جوہی سب سے پہلے آگے بڑھی چپ کرانے لگی مگر خود روئی تو ساون بھادوں سے زیادہ' چھاجوں برسی' اتنا اتنا کہ جل تھل ہوگیا۔ آنسو تھمے تو زندگی کے کنوئیں میں اتھاہ خاموشی چھائی تھی ایک زرد گلاب تھا' شیشہ دل پر گرا ہوا بوجھ بڑھتا ہوا۔

"جوہی! سنبھالو خود کو۔ مسٹر عارف کی کمی واقعی پوری نہیں ہو سکتی لیکن یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ ان پر صرف صبر کرنا چاہئے۔"

اس نے سر ہلا کر سامنے رکھے مسودے کو دیکھا تبھی دستک ہوئی وہی بوڑھا ملازم سامنے کھڑا تھا۔

"مس جوہی سے ملنا ہے جی....."

"افوہ بابا جی آپ۔ آئیے آئیے....." وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شامی اسے ہمت بندھانے کو کہتا اپنے کمرے کی سمت بڑھ گیا اور جوہی مجسم متوجہ ہو کر اس ملازم کو دیکھنے لگی۔

"کہئے بابا جی! کس سلسلے میں ملنا تھا آپ نے مجھ سے....."

"وہ جی بی بی صاحب! یہ صاحب کا آخری افسانہ تھا جی۔ انہوں نے مجھے اپنے جانے سے تین دن پہلے دیا تھا۔ کہنے لگے۔ "رحیم جی! یہ آپ بہت احتیاط سے بی بی صاحب کے حوالے کیجئے گا۔ یہ امانت اب آپ کے حوالے جی....."

اس نے مسودہ میز پر رکھ دیا۔ چلنے لگا پھر مڑا اور بولا۔

"بڑے یاد آتے ہیں سرکار' بہت بھلے لوگ تھے بی بی جی! ایسے لوگ برسوں میں آتے ہیں جی مگر منٹوں میں اٹھ جاتے ہیں۔ پیچھے حیرت افسوس چھوڑتے ہیں۔ اچھا جی چلوں اب....."

دروازہ کھول کر وہ باہر نکل گیا تو اس نے بے دلی سے افسانہ سامنے رکھا۔ ایک انسان کی حیثیت سے مرنے کا دکھ تھا اسے مگر اعتبار اٹھنے پر ان کے لکھے لفظوں کی طرف دل کشش کرنے سے کترا رہا تھا مگر لفظ کشش ثقل سے بھی زیادہ تیزی سے اسے اپنی طرف کھینچتے چلے گئے۔

تحریر میں تذکرہ تھا افسانہ نگار کا جو مصور بھی تھا۔ جو خود خاموش تھا مگر اس کے رنگ بولتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے رنگوں نے زندگی پالی۔ ایک اپسرا اس کی زندگی کے کینوس پر مسرت بن کر سمٹ آئی مگر یہ سر خوشی زیادہ دیر کے لئے نہ تھی۔ دھواں بن کر مسرت اڑ گئی تو راکھ بچی۔ وہ اس راکھ سے لفظ بنانے بگاڑنے لگا۔ تب بس اچانک وہ مرا ہوا شخص پھر سے جی اٹھا۔ زندگی ترنگ میں ڈھل گئی۔ پھر اچانک جانے کیا ہوا' وہ لفظوں کا بھاؤ مول کرنے والا بنجارا' وہ جوگی اندر ہی اندر پھر سے مر گیا۔ جیتا تو وہ پہلے بھی نہ تھا مگر نظر کے سامنے تو تھا۔ سو مر گیا تو ایک تصویر نکلی۔ ایک نامکمل تصویر۔ سوال کرنے والے نے پوچھا۔

"مصنف کیا مصور بھی تھا.....؟"

جواب دینے والے خاموش گھر نے کہا۔

"مصنف لفظوں سے بت گری ہی تو کرتا ہے۔"

یوں زندگی اوور لیپ ہوئی اور منظر بھی بدل گیا۔ خاموش گھر میں رنگ شہانی پرندوں کی طرح چہچہانے لگے۔ زندگی نے پوچھا۔

"یہ کون بت ہے جس کو تراش رہے ہو....."

مصنف نے کہا۔ "یہی تو راز ہے جسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو یہ ہے مگر زندگی سنو۔ تم نے کبھی کسی جج کو آخری فیصلہ سناتے ہوئے دیکھا ہے۔"

زندگی نے کہا۔ "کیوں نہیں۔ منصف جج ایسے ہر فیصلے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتا ہے۔" تو مصنف مسکرایا پھر بولا۔

"بس زندگی سمجھو' یہ بھی میری زندگی کی آخری تصویر ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے کسی کی ہنسی پینٹ کرنے کا۔ لفظ میری ملکیت سہی لیکن حیات۔ فانی لفظوں میں وہ رچاؤ نزاکت کہاں جو میں مسکراہٹ پر کچھ لکھوں۔ یہ مسکراہٹ صرف دھنک رنگوں سے ہی پورٹرے کی جا سکتی ہے۔ تم دیکھنا جب یہ تصویر مکمل ہوگی تو مسیحائی کا روپ دھار لے گی۔ ان کہی کی طرح' ان کھلی مسکراہٹ کا بھی ایک اثر ہوتا ہے۔ سوچ اور اطمینان کا اچھوتا کمبی نیشن مسکرانا بھی اور مسکراہٹ چھپا بھی لینا' حسن ہے' زندگی کا نایاب

حسن۔۔۔"

زندگی ہنس پڑی۔ پھر برسوں بعد جب مصنف کا کمرہ کھولا گیا تو دروازے پر دو عکس تھے۔ ایک وہ جو تصویر میں مجسم تھا۔ ایک عکس وہ تھا جو تصویر میں کہیں نہیں تھا مگر مصنف کے دن ورات اسی کے تابع تھے کپکپاتے ہوئے دو عکس اور کہیں بیچ میں مصنف کا وجود۔

کہانی یہاں تھم گئی تھی۔ راوی چپ کھڑا تھا اور جوہی کی سانسیں رکنے لگی تھیں اور کہیں قریب مسٹر عارف صہبائی ملول سے بیٹھے تھے۔

"کبھی کبھی ہمارا دل چاہتا ہے۔ مس جوہی! ہم صرف اپنا دکھ لکھیں۔ شام الم کا قصہ چھیڑیں، بین کریں اور سب لوگ ہمیں ساکت دم سادھے دیکھتے چلے جائیں اور کہیں، یہ کہانی واقعی ان میں سے کسی کی نہیں، یہ بیتی کسی اور ہی پر بیتی ہے اور وہ رائٹر کے سوا کون ہو سکتا ہے۔۔۔"

اس نے سماعتیں بصارت کے ہم رکاب کر دیں تو پڑھا۔

اور پھر دو عکس ڈبڈبائے آنسوؤں کی طرح کپکپاتے رہے۔ کمرے میں ہر طرف جالے ہی جالے تنے تھے۔ ان کہے حرفوں کے، ان کہے خوابوں کے جالے اور بیچ کمرے کے دل لٹکا تھا۔ بجھا ہوا راکھ شدہ۔ ایک عکس نے اس راکھ کو پلو میں باندھا اور ایک عکس وہیں دل کی تربت بنا کر بیٹھ گیا۔ سمے گزرا تو خاموش کمرے نے کہا۔

"اے عکس دل! تمہیں پتا ہے یہ مصنف کیوں مرا؟" عکس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"نہیں۔۔۔" دل کے گنبد سے صدا ابھری تو کمرے میں بکھری ٹوٹی سانسوں کے تانے بانے آپس میں الجھنے لگے اور تنہائی نے کہا۔

"یہ شخص صرف اس لئے مر گیا کہ تمام عمر اس نے اس سے محبت کی جس سے نفرت کرتا رہا اور تمام عمر اس عکس کی بے مہری کا شکار رہا جسے پوجتا رہا۔ اس وقت سے جب وہ عکس ابھر کر کسی سانچے میں بھی نہیں ڈھلا تھا۔ سنو یہ نامکمل ادھ کھلی مسکراہٹ پر ثبت ہونٹ دیکھو کس کے ہیں، ہاں صرف تمہارے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ وہ مصنف لفظوں کا بیوپاری تھا، سوداگر تھا۔۔۔"

"سوداگر مگر محبت پر بکنے والا۔ تمہیں پتا ہے۔ اس نے تمام عمر اس عکس کو کیوں چاہا جس سے نفرت کرتا رہا۔۔۔"

خاموش سائیں سائیں عکس ڈولنے لگا تو نامحسوس کسی نے اس عکس کا ہاتھ تھام لیا پھر کہا۔

"تم اسے اذیت پسندی کہہ سکتی ہو مگر جس نے لمحہ اذیت گاہ میں گزارا ہو۔ اس کے لئے تو اذیت بھی نشہ و سرور بن جاتی ہے پھر جب مطمع نظر انتقام لینا ہو یہ اذیت تو اور بھی دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ وہ عکس تمام عمر احساس محرومی کا شکار رہا۔ اچانک اک حادثے کے سبب ہی سہی اس کا احساس محرومی ختم ہونے کے دن آپہنچے تو اسے عجیب سا لگا۔ اسے یہ عجیب لگنا ہی چاہئے تھا۔ اس شخص کی طرح جس کے ہاتھوں میں آتے آتے شدت پیاس سے جام چھوٹ جائے۔ آنسو ہی تشنگی مٹا دینے کا سبب بن جائیں۔ سیرابی کا دوسرا نام تشنگی ہو جائے تو یہ انہونی تو نہیں اس نے کبھی سوچا جو ماہ و سال خشک بنجر گزر گئے۔ ان کا حساب کبھی لیا جا سکتا مگر جو خوشیاں چھن گئیں۔ ان کا انتقام لیا جا سکتا ہے۔ بس یہیں سے اس نے غرور سے عکس مگر حادثے سے ملول چہرے کے حسد کو جھٹلاتے ہوئے اس چہرے کی اذیت بڑھانے کو کہا۔ "میں نے زندگی میں صرف جس لڑکی کو چاہا وہ تم ہی تو ہو۔ صرف میری جیب میں ہی نہیں میرے دل میں بھی تمہاری ہی تصویر ثبت ہے۔"

نامکمل تصویر کی آنکھوں میں آنسو لہرا گئے مگر اس نے نظریں موڑ لیں۔ سینے میں ٹیس اٹھی مگر وہ وہاں سر جھکائے عکس نے نامکمل تصویر کو دیکھا جو نامحسوس بندھن میں بندھے ہاتھوں کو اور مصنف تھا، جسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا آنکھوں سے دیکھتا ہوا۔

"یہ محبت کی انتہا ہے کہ میں نے تمہیں چاہا مگر تمہارے لئے خار نہیں بچھائے۔۔۔"

دوسرا عکس تڑپ کر سامنے آگیا۔ مصنف سے جھگڑنے لگا لڑتے لڑتے تھک گیا تو دیکھا۔ مصنف بے دم سا اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح دونوں عکس باہم اس کے گرد کھڑے تھے یوں جیسے کسی موڑ پر جدا ہوتے ہوئے دل۔ تنہائی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور کھلی آنکھوں میں یاس و ناامیدی بحوال رقصاں تھے۔

محبت کا کبھی تشنہ کام رہنا اور مرجانا عام تحریروں کا سا اختتام تو نہیں تھا مگر یہ اختتام ہو گیا تھا اور وقت بیوہ کی طرح بین کر رہا تھا۔ محبت کی قسمت پر، اپنی ستم ظریفیوں پر یا مصنف کی حرماں نصیبی پر کچھ سجھائی نہ دیتا تھا سوائے آہوں سسکیوں کے اور یہی آہیں سسکیاں ہی تو محبت کا ثمر اور سوغاتیں ہیں۔۔۔

جوہی پڑھتے پڑھتے تھک گئی۔ رونے لگی۔ وقت کی طرح پھر روتے روتے سنبھلی بھی نہ تھی کہ فون کی بیل بجی۔ ابھی اس نے ریسیو کیا تو دوسری طرف کوئی اس کی طرح آہ بنا ہوا تھا۔

"ہیلو کون ہیں آپ۔۔۔؟"

"کوئی نہیں یا شاید کچھ ہونے ہی کا زعم تھا مگر یہ زعم غرور آج ٹوٹ گیا جوہی تمام عمر میں کہتی رہی 'میں ہوں' عارف نہیں ہونے کا بھیس بھرے رہے۔ اب وہ نہیں ہیں تو لگتا ہے۔ حادی ہیں اور میں ہوتے ہوئے بھی لگتا ہے۔ نہیں ہوں۔ جوہی! تمام عمر میں نے ان کی کوئی تحریر نہیں پڑھی۔ مجھے لگتا تھا۔ وہ وقت برباد کر رہے ہیں۔ مجھ سے بھاگنے کے لئے قلم کاغذ کا سہارا لیتے ہیں۔ بس اسی حسد میں میں نے ہمیشہ انہیں اور ان کی تحریروں کو نظر انداز کیا مگر آج یہ آخری تحریر پڑھ کر سوچتی ہوں۔۔۔ کاش میں اپنے ارادہ میں ہی اٹل رہتی تاکہ اس گمان میں تو ہوتی کہ عارف کی جیب ہی نہیں دل میں بھی میری ہی تصویر نقش ہے مگر اب گمان، یہ بہلاوا بھی کہاں، جوہی آج مجھے رونا آرہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں سمندروں روؤں۔ عارف کی نہ ملنے والی محبت پر۔ اپنے زعم پر۔ حسد پر تمہاری رسائی پر۔ عارف کے دل میں تمہارے مقام پر۔ خود پر۔ ان گول گوتھنے سے بچوں پر جنھوں نے میری رقابت سے روٹھ کر دنیا میں آنے کو فضول سمجھا آرزو جب تک آرزو رہے۔ تسلی رہتی ہے لیکن جوہی! آرزو حقیقت کا روپ دھارنے کے بعد چھین لی جائے تو اذیت بن جاتی ہے۔ عارف نے جتنا کرب، جتنی اذیت سہی۔ آج مجھ میں وہ اذیت دو آتشہ ہے۔ جوہی! تم یہ اذیت سوچ سکتی ہو۔۔۔"

یکلخت کہتے کہتے ریسیور سے سسکیاں، ہچکیاں گونجنے لگیں۔ وہ دلاسا دینا چاہتی تھی مگر ان سے زیادہ چھاجوں رونے لگی۔ شامی کسی کام سے آیا تو حیران رہ گیا۔

"جوہی! تم پھر رو رہی ہو۔۔۔"

جوہی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر بڑبڑائی۔ "کوئی موسم ہو، وصل و ہجر کا۔ دل والوں کے لئے ایک موسم ہے۔"

آنسو۔ بے تحاشا سسکیاں۔ کہتے کہتے شامی کو پھر سے دیکھا پھر ہذیانی سے انداز سے بولی۔

"شامی! یہ محبت کا کنول وہیں کیوں کھلتا ہے جہاں آنسوؤں کا پانی رہتا ہے۔" شامی کیا کہتا۔ چپ کا چپ رہ گیا اور وقت اس سے اس سے کہیں زیادہ خاموش تھا۔

--*